سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 4 شمارہ 1

جنوری تا مارچ 2019ء

مدیر

فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو وفارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. IV Issue: I

January to March 2019

ISSN: 2456-4001

قیمت : فی شمارہ:۱۵۰/روپے، سالانہ:۵۰۰/روپے، پانچ سال کے لیے:۲۰۰۰/روپے

نوٹ : 'فیضان ادب' کی سالانہ خریداری کے لیے چیک یا ڈرافٹ پر صرف فیضان حیدر لکھیں۔ یہ رقم بینک ٹرانسفر یا ادارے کی ویب سائٹ www.uprorg.in کے ذریعے بھی روانہ کی جاسکتی ہے۔ تخلیقات یا مضامین faizaneadab@gmail.com پر روانہ کریں۔

آنلائن رقم ٹرانسفر کرنے کی تفصیل:

Name: Faizan Haider, Account No. 33588077649, State Bank of India, Branch: Maunath Bhanjan (Shahadatpura), IFSC: SBIN 0001671,

- ☆ مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
- ☆ مقالوں کی ایڈیٹنگ میں ادارہ آزاد ہے۔
- ☆ 'فیضان ادب' کے مکمل حوالے کے ساتھ مضامین یا اقتباسات نقل کیے جاسکتے ہیں۔
- ☆ 'فیضان ادب' کے سبھی شمارے ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی کی ویب سائٹ www.uprorg.in سے ڈاؤنلوڈ کیے جاسکتے ہیں۔
- ☆ تمام تر قانونی چارہ جوئی صرف مئو کی عدالت میں ہی ممکن ہے۔

آنر، پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر فیضان حیدر نے اسکرینو پرنٹرس، فاروقی کٹرہ، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن، مئو سے چھپوا کر ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، یوپی 275305 سے شائع کیا۔

فہرست

تحقیق وتنقید

نقش ہائے رنگ رنگ

قند مکرر

طاق نسیاں سے

تعارف وتبصرہ

مدیر کے قلم سے

عصر حاضر میں جدید ٹکنالوجی اور جدید وسائل ہر گھر کی ضرورت بن گئے ہیں۔ بدقسمتی سے نئی نسل کتابوں سے انسیت پیدا کرنے کے بجائے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہی ہے۔ جدید وسائل جس طرح عام ہوتے جا رہے ہیں ویسے ہی مطالعے کا رواج، کتابوں اور مجلّوں کی خریداری کا ذوق بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وقت کی قلت نے جہاں لوگوں سے مطالعے کی عظیم دولت چھین لی ہے وہیں نئی نئی مشکلات بھی پیدا کر دی ہیں۔

مطالعہ اخلاق، تہذیب، معاشرت، ثقافت، نفسیات، سائنس اور دیگر علوم وفنون کو سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ مطالعے سے جہاں ذہن ودماغ اور تفکر وتخیل کی آبیاری ہوتی ہے وہیں معاشرہ بھی پروان چڑھتا ہے۔ کتابیں ہماری قوم وملت کا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہیں جن سے نہ صرف ہمیں اسلاف کے کارناموں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان کے طرز زندگی، نشیب وفراز، بود وباش اور رہن سہن کا بھی پتا چلتا ہے۔ ان کے نقش قدم پر چل کر قوم وملت کی ذہنی نشو ونما اور فلاح و بہبود نیز کامیابی وکامرانی کی راہیں بھی ہموار ہوتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ شعرا، ادبا اور قارئین کی ایک بڑی تعداد لائبریریوں میں بیٹھ کر مطالعے میں مصروف ومنہمک رہا کرتی تھی، لیکن اب کتابوں کے مطالعے کا رجحان دم توڑ رہا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ محلے اور گاؤں کی سطح پر منصوبہ بند طور پر عمومی کتب خانے قائم کیے جائیں اور اس کے لیے سیاسی جماعتوں کے ساتھ دیگر اردو تنظیموں کو مل کر سنجیدگی سے کام کرنا ہوگا۔

مطالعے کی ختم ہوتی روایت کو بچانے اور لوگوں میں مطالعے کی شرح بڑھانے کے لیے دور حاضر میں رسالے اور مجلّے نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے 'فیضان ادب' کے اجرا کا ارادہ کیا تھا تو اپنے کئی اساتذہ سے مشورے کیے۔ بعض نے تو اسے خوش آئند قدم قرار دیا اور مفید مشوروں سے نوازا لیکن بعض نے اسے شوق فضول گردانا۔

اب جب زیر نظر شمارے کا اداریہ لکھنے بیٹھا ہوں تو وہ مناظر بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہے

ہیں۔ اگر اردو کے تئیں ہمدردی کے سلسلے میں ان کے زبانی جمع خرچ اور نصیحتوں کی بات کروں تو اللہ کی پناہ!......لیکن یہ نیم جاں کیا کرے..................اپنے ہی غیروں کی نظر سے دیکھتے اور اس کے ساتھ تعصب برتتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ ایسی سخت جان ہے کہ سب کچھ برداشت کر لیتی ہے اور چہرے پر شکن بھی نہیں آنے دیتی......

اردو اکادمیوں، اداروں، مشاعروں، کانفرنسوں اور سمیناروں کا حال المیہ سے کم نہیں......ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملی جلی سازش ہے جو ملک گیر پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ اردو کے سرکاری اداروں کے بلند عہدوں پر اردو مخالف حکومت کی کٹھ پتلیاں بٹھا دی گئی ہیں جن کے دل میں اردو سے محبت ہے نہ اردو داں طبقے سے ہمدردی......وہ صرف اپنے عہدوں کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اہل اردو کی سوغاتوں کا ذکر کروں تو مقدر پر رونا آتا ہے کہ ان کی اولاد اردو کے الف سے بھی نا آشنا ہے اور وہ خواب غفلت کا شکار ہیں......انھیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ ان کی اولاد کس راہ پر گامزن ہے۔ ہم اس بے بسی اور بے سروسامانی پر سر پیٹنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

....

'فیضان ادب' کے نیر مسعود نمبر کی کامیاب اشاعت پر اردو کی کئی سر برآوردہ شخصیتوں نے نہ صرف اس ناچیز کاوش کو سراہا بلکہ تہنیتی خطوط بھی لکھے جن سے ادارے کے حوصلے میں مزید استقامت پیدا ہوگئی۔ ادارہ تہ دل سے ان کا شکر گزار ہے۔ اب ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر سال اردو یا فارسی کی کسی علمی وادبی شخصیت، صنف پر خصوصی شمارہ یا گوشہ پیش کرے۔ توقع ہے کہ سال رواں کا متعاقب شمارہ 'رضا نقوی واہیؔ' کی حیات وخدمات پر مشتمل ہوگا۔ قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے گرانقدر مضامین ارسال فرمائیں تاکہ ادارہ واہیؔ کے شایان شان خصوصی شمارہ پیش کر سکے۔

نئے سال کی آمد پر 'فیضان ادب' نے اپنی اشاعت کے تین سال مکمل کر لیے۔ اب چوتھے سال کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ 'قند مکرر' کے ضمن میں علامہ اقبالؔ کی مشہور فارسی مثنوی 'مسافر' بھی شامل ہے۔ ساتھ ہی اس شمارے سے ایک نئے عنوان 'طاق نسیاں سے' کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں بے نیازانہ زیست کرنے والے شعرا وادبا کا تعارف اور ان کی تخلیقات پیش کی جائیں گی، اس خیال سے کہ 'زمانہ ان کو بھلا نہ دے'۔ چنانچہ اس شمارے میں اس عنوان کے تحت سید ضامن حسین گویاؔ جہان آبادی کی مثنوی 'فغان صبح ومسا' شامل کی گئی ہے۔ امید قوی ہے کہ اس شمارے کے مشمولات بھی آپ کو پسند آئیں گے۔

فیضان حیدر

پروفیسر شعیب راہی: حیات وخدمات

سید حسن عباس

سید محمد شعیب متخلص بہ راہی معروف بہ شعیب راہی سہسرام کے ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے والد سید محمد ایوب متخلص بہ شمیم (۱۹۰۴-۱۹۷۷ء) مصنف 'انمول جواہر' ایک اچھے شاعر وادیب اور معلم تھے۔ انھوں نے ندوۃ العلما لکھنو میں تعلیم حاصل کی تھی مگر تکمیل تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہوئی۔ شمیم ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اپنے نام یا تخلص کے ساتھ ندوی بھی لکھتے تھے اور اسی نام سے یعنی شمیم ندوی سے مشہور بھی تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں اور سرپرست مولانا حکیم رکن الدین دآنا کی زیر نگرانی تعلیم پائی تھی۔ یہ وہی حضرت دآنا ہیں جنھیں ندوہ میں تحصیل علوم کے دوران مولانا شبلی نعمانی نے ندوہ کے ایک اجلاس میں فخریہ انداز میں متعارف کرایا تھا اور حضرت دانا نے عربی اور اردو میں اپنی تقریروں سے حاضرین کا دل جیت لیا تھا۔ وہ بھی ایک اچھے شاعر تھے اور دآنا تخلص کرتے تھے۔ ان کا گہرا اثر حضرت شمیم نے قبول کیا تھا اور خود بھی اچھے شعرا کی صف میں داخل ہو گئے تھے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد شمیم ندوی کا تقرر ڈالٹن گنج میں گروَر ہائی اسکول میں علوم مشرقیات کے استاد کی حیثیت سے ہوا۔ وہ اردو سے متعلق بے شمار کاموں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے انھوں نے پلاموں کمشنری میں اردو کی تحریک کو فعال بنانے میں جو اہم کردار ادا کیا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ بقول نادم بلخی ''ان کا شعری سرمایہ بھی محفوظ ہے۔''

ان کی ایک نثری تالیف 'انمول جواہر' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں پٹنہ سے شائع ہوئی تھی جس پر علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور پروفیسر عبدالمنان بیدل کی گرانقدر آرا ہیں۔ کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف سید ریاست علی ندوی نے کرایا ہے اور 'احوال واقعی' کے عنوان سے

خود مولف نے کتاب کے بارے میں اپنے خیالات اور تجربات تحریر کیے ہیں۔ کتاب دراصل اردو کے اہل قلم اور صاحب طرز حضرات کے منفرد، دلچسپ، مفید جملوں، فقروں اور عبارتوں کا مجموعہ ہے جو مختلف موضوعات کے تحت یکجا کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں مولف نے اپنے گہرے ادبی ذوق کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھیں حضرت شمیم ندوی کے زیر سایہ ان کے فرزند شعیب راہی کی نشوونما ہوئی۔

شعیب راہی کی تاریخ ولادت میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق ۴/نومبر ۱۹۳۲ء ہے اور 'بہار کے نظم نگار شعرا' (ص ۳۱۵) میں صرف سال ۱۹۳۲ء درج ہے۔ پروفیسر نادم بلخی نے راہی کی وفات کی خبر مجلہ 'توازن' مالیگاؤں، شمارہ ۱۸ میں شائع کروائی تھی۔ وہاں تاریخ ولادت ۶/جون ۱۹۳۰ لکھی گئی ہے۔ 'تذکرہ مسلم شعرائے بہار' جلد ۲/صفحہ ۴۴ میں ۱۲/محرم الحرام ۱۳۴۷ھ/یکم جولائی ۱۹۲۷ء لکھی ہوئی ہے۔ مذکورہ تاریخوں میں 'مسلم شعرائے بہار' میں درج تاریخ ولادت ہی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تذکرہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شعیب راہی نے اپنے حالات لکھ کر خود ہی صاحب تذکرہ کو بھیجے تھے۔

شعیب راہی نے گروَر ہائی اسکول ڈالٹن گنج سے جہاں ان کے والد شمیم ندوی ٹیچر تھے، مارچ ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۷ء میں انٹر اور ۱۹۵۹ء میں بی۔اے (اردو آنرز) مقامی جی۔ال۔اے کالج ڈالٹن گنج سے نمایاں طور پر پاس کیا۔ ۱۹۶۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کیا۔ ۱۹۶۲ء میں جی۔ال۔اے کالج ڈالٹن کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۲۶/دسمبر ۱۹۶۲ء کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے پروفیسر اختر اورینوی کی نگرانی میں خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی پر اردو میں تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تقریباً ۲۷ سال جی۔ال۔اے کالج ڈالٹن گنج کے شعبۂ اردو میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے دوران ملازمت ۱۶/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور ڈالٹن گنج کے اسی قبرستان کو اپنی ابدی آرامگاہ بنا لیا جہاں ان سے پہلے ان کے والد شمیم ندوی اور استاد مہجور شمسی آرام فرما تھے۔ شعیب راہی کے انتقال پر نادم بلخی نے دو قطعات تاریخ کہے۔ ایک سے ہجری اور دوسرے سے عیسوی سال برآمد ہوتا ہے۔ پہلا قطعۂ تاریخ وفات:

اے شعیب راہی راہ محبت ہائے ہائے
آخرش دے ہی گیا تو داغ فرقت ہائے ہائے
از سر ابجد ہوا ہجری میں نادم سال مرگ
انتقال پُر ملال پاک طینت ہائے ہائے
۱۳۰۹+۱=۱۳۱۰

دوسرا قطعہ:

ہوا روانہ عدم کی جانب قدم بڑھا کے شعیب راہی
لحد میں سویا غمِ جہاں سے فراغ پا کے شعیب راہی
مسیحی تاریخ مرگ نادم یہی شکستہ زباں سے نکلی
جہان چھوڑا بسے ہے خلد بریں میں جا کے شعیب راہی
۱۹۸۹ء

شعیب راہی بھی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ کئی ادبی اور سماجی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ شہر کی بزمِ ادب کے روح رواں تھے۔ کالج کے سالانہ میگزین کے حصۂ اردو کے مدیر تھے۔ ان پلیٹ فارموں سے وہ اردو کے فروغ کی ہر ممکنہ کوشش کیا کرتے تھے۔ بقول بیتاب صدیقی:

''ڈاکٹر شعیب راہی کی دوسری علمی ادبی تحریکوں سے بھی ہمیشہ عملی وابستگی رہی جس نے ان کے علم وفن، ان کے نظریات وافکار میں بڑی گہرائی اور توانائی پیدا کی۔''

آثار:

ڈاکٹر شعیب راہی کو نظم ونثر دونوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ بہت اچھے ادیب، شاعر اور معلم تھے۔ تحقیق وتنقید سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مذکورہ میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کی درج ذیل تصانیف ہیں:

۱-خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی- حیات اور شاعری: یہ ان کی پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا۔ اگرچہ خواجہ آتش لکھنوی کوئی بہت اچھوتا موضوع نہیں تھا مگر ڈاکٹر راہی نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کی اور مطلوبہ مواد کو بڑی محنت اور سلیقے سے کتابی صورت میں جمع کیا۔ اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آتش پر وقتاً فوقتاً بہتیرے مضامین شائع ہوئے۔ لیکن اب تک کوئی ایسا مضمون نظر سے نہیں گزرا جس میں ان کے عہد کے تاریخی، مذہبی، سماجی، معاشرتی اور ادبی پس منظر کے ساتھ ان کے ذاتی حالات اور ان کی شاعری سے متعلق تمام باتیں مکمل طور پر تحقیقات کے ساتھ لکھی گئی ہوں۔ لہٰذا یہ مقالہ اسی منشا سے مرتب کیا گیا۔''

کتاب کا انتساب پروفیسر اختر اورینوی کے نام ہے۔ تعارف بیتاب صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ 'موضوعِ سخن' کے عنوان سے مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے بیتاب صدیقی نے لکھا ہے:

''مصنف نے بڑی تحقیق وجستجو، کدوکاوش، انتہائی جانفشانی اور پوری محنت سے کام لیا ہے۔ جو مواد قارئین کرام کے سامنے موجود ہے وہ خود اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ یہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔''

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب ذیلی عناوین میں منقسم ہے۔ پوری کتاب ۳۱۴ صفحات میں جون ۱۹۸۲ء میں دی آزاد پریس، پٹنہ سے شائع ہوئی تھی۔

۲-انداز آگہی: شعیب راہی کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ یہ ان کے ۱۸ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو طلبا کی درسی ضرورتوں کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں۔ مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) اصولِ نقد کی چند باتیں (۲) سب رس (۳) قطب مشتری (۴) خسروؔ (۵) صوفیائے کرام اور اردو (۶) ولیؔ اورنگ آبادی (۷) انار کلی (۸) افسانہ نگاری میں تکنیک کی اہمیت (۹) گئودان (۱۰) انشائیہ اور غبارِ خاطر (۱۱) ادبی تنقید کے مسائل (۱۲) فن میں مقصد کی اہمیت (۱۳) اکبرؔ الٰہ آبادی (۱۴) اصغرؔ گونڈوی (۱۵) فراقؔ (۱۶) حالیؔ (۱۷) فن کی جمالیاتی قدریں (۱۸) زارؔ عظیم آبادی

پروفیسر وہاب اشرفی نے 'تقریب' کے عنوان سے کتاب اور مصنف کا تعارف لکھا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں ۱۹۰ صفحات میں پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے آخر میں مصنف کی درج ذیل کتابوں کا اشتہار بھی دیا گیا ہے جو اس طرح ہے:

☆ سب رس کا تنقیدی مطالعہ (زیرِ اشاعت) ☆ عبدالمغنی کا تنقیدی نظام (زیرِ تحریر)
☆ مقدمۂ کلامِ داغ (زیرِ اشاعت) ☆ اجالوں کا حصار [غزلیات] (زیرِ اشاعت)
☆ وہاب اشرفی کا تنقیدی موقف (زیرِ تحریر) ☆ اعجازِ آگہی [تنقید] (زیرِ ترتیب)

درج بالا کتابوں میں سے تین کے لیے زیرِ اشاعت، ایک کے لیے زیرِ ترتیب اور دو کے لیے زیرِ تحریر لکھا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور نہ ہی سوائے 'مقدمۂ کلامِ داغ' اور 'اجالوں کے حصار' کے کسی اور کتاب کا مسودہ موجود ہے۔ 'پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی نظام' کے عنوان سے پروفیسر راہی نے چند مضامین ضرور قلمبند کیے تھے جو شائع بھی ہوئے۔ ممکن ہے اسی سلسلے کو وہ بعد میں کتابی صورت دینے کا قصد رکھتے ہوں۔

۳-امت اردو کا مرثیہ: ۲۳ رصفحات کا یہ کتابچہ ۳۰ ربند پر مشتمل ہے جو بنگلہ دیش میں اردو آبادی پر ہونے والے مظالم کی تفصیلات پیش کرتا ہے۔ اس کا انتساب موضوع کی مناسبت سے تاریخ کربلا کے نام کیا گیا ہے۔ یہ نظم ۱۹۷۲ء کی تصنیف ہے جو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی جانب سے غلام سرور کے خط اور بیتاب صدیقی کے 'پیش لفظ' کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ بعد میں راہی کی نظموں کے مجموعے 'گمنام کوچے کی صدا' میں بھی شامل کی گئی ہے۔ غلام سرور نے اس کتابچے کو انجمن کے دفتر کو بہ غرض اشاعت بھیجتے وقت جو خط لکھا تھا، اس میں راہی کے شاعرانہ کمالات کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شعیب راہی شاعر ہیں، حساس دل رکھتے ہیں، جذبات کے راجا ہیں اور قلم کے بادشاہ ہیں۔ 'امت اردو کا مرثیہ' جہاں ایک طرف آنکھوں میں آنسو بھر دیتا ہے وہیں سر میں سودا بھی پیدا کر دیتا ہے اور ذہن میں عزم جواں بھی۔ یہ ایک بیان واقعہ بھی ہے اور پیام نو بھی۔''

اگر مذکورہ بالا خیال کو مبالغہ پر بھی مبنی سمجھا جائے تو اتنا ضرور ہے کہ راہی حساس دل کے مالک تھے اور قلم کے دھنی بھی۔ بیتاب صدیقی اپنے 'پیش لفظ' میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر شعیب راہی کی نظم مسدس 'امت اردو کا مرثیہ' انھیں خونچکاں، الم انگیز اور دردناک کوائف وحالات کی منہ بولتی تصویر ہے یا بہاری مظلومین بنگلہ دیش کا نوحہ ہے۔ نظم فنی وشعری محاسن اور صنف مرثیہ کی معنوی اور صوری خوبیوں کے اعتبار سے ایک اعلیٰ پایہ شعری تخلیق ہے۔ شاعر نے زور بیان، قادر الکلامی، روانی وسلاست بیان کا پورا ثبوت پیش کیا ہے اور سچ پوچھیے تو 'از دل ریزد و بر دل خیزد' کے مصداق ہے۔''

۴-نقوش مہجور: یہ کتاب مہجور شمسی (م: ۱۹۷۴ء) کے ۳۹ رشاگردوں کے تعارف وتذکرے اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے جسے بزم مہجور، ڈالٹن گنج نے ۱۹۷۵ء میں ۶۷ رصفحات میں شائع کیا تھا۔ اس میں ہر شاعر کی دو نمائندہ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

۵-مقدمۂ کلام داغ: اس کتاب کا مسودہ کاپی پر لکھے ہوئے ۱۳۰ رصفحات پر مشتمل ہے جو بخط مصنف ہے۔ شعیب راہی نے پیش لفظ میں اس کی تالیف کی غرض وغایت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''نواب مرزا خاں داغ دہلوی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن جو کچھ ہے وہ حالت انتشار میں ہے اور اکثر ایک ہی بات کی تکرار ہے۔ ڈاکٹر سید علی محمد زیدی کی کتاب 'مطالعۂ داغ' ایک تحقیقی کاوش ضرور ہے لیکن داغ کی شاعری سے تنقیدی بحث تقریباً

عنقا ہے اور کچھ ہے بھی تو روایتی انداز میں ہے جن سے طلبا کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ میں نے اس کتاب 'مقدمۂ کلام داغ' میں اسی ضرورت کے پیش نظر داغ کی شاعری سے تنقیدی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا ہے کہ کلام داغ کو ان کے عہد کے تناظر میں پرکھا جائے۔ میرے خیال میں داغ عہد شکست وریخت کے شاعر تھے جس کے تمام نقوش ان کے کلام میں موجود ہیں۔''

اس کتاب کا انتساب پروفیسر وہاب اشرفی کے نام کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی مشہور کتاب 'مقدمۂ کلام آتش' سے متاثر ہو کر داغ کے بارے میں یہ کتاب لکھی ہے اور اس کا نام بھی اسی طرز پر 'مقدمۂ کلام داغ' رکھا۔ یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور راہی صاحب مرحوم کے خانوادے میں محفوظ ہے۔

۶-گمنام کوچے کی صدا (شعری مجموعہ): شعیب راہی مرحوم ایک استاد، ادیب اور ناقد ومحقق ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۴۰ رنظموں پر مشتمل ہے۔ ان کا صاف وسادہ اسلوب اور فکر وخیال کی ندرت ان کے کلام سے پوری طرح عیاں ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی نے ان کے فکر وخیال میں عجیب تبدیلی رونما کی۔ ملک کے افلاس زدہ ماحول سے انہیں بیزاری تھی۔ وہ بھی دیگر ترقی پسند شعرا وادبا کی طرح اپنے کلام سے انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ وہ جمہوریت اور سوشلزم کے لیے برسرپیکار قوتوں کے حامی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس مجموعے کا انتساب ان قوتوں کے نام کیا ہے جو امن، جمہوریت اور سوشلزم کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ جمہوریت اور سوشلزم کو وہ نعرہ نہیں مقصد حیات سمجھتے تھے۔ اس استبداد، فرقہ پرستی، انسانی اقدار کی شکست وریخت اور فاشسٹ قوتوں کے خلاف قلم کا جو زور اور افکار کا جو بہاؤ نظر آتا ہے اس سے شاعر کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کے ساتھ ملکی سطح پر ان منفی رویوں کو بھی بخوبی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے جنھوں نے ملک کے سیکولر ڈھانچے کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ انسانی سماج میں اس وقت بھی امن وآشتی، یکجہتی، دردمندی، ہمدردی اور دستگیری کا فقدان تھا اور آج بھی یہ عنقا ہے۔ دانشوروں نے شاید اس مجموعے کو جس طرح دیکھنا چاہیے تھا نہیں دیکھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ شعیب راہی کا شمار ترقی پسند شعرا کی صف میں نہ کیا جاتا۔ بیتاب صدیقی نے اس مجموعے کی نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے:

''شعیب راہی کی شاعری نظام جبر واستبداد کے خلاف بغاوت وانقلاب ہے۔ باغی اور انقلابی شاعری وقتی چیز ہو سکتی ہے مگر جب تک جبر واستبداد کا نظام باقی ہے، یہ

شاعری زندہ رہے گی۔''
مجموعہ کی پہلی نظم 'فن کار' ملاحظہ ہو:

سرِ بازار جو فنکار پھرا کرتا ہے
دل میں کتنی نئی تخلیق کی حسرت لے کر
دوش پر اپنے ہی افکار کی جنت لے کر
ذہن اس کا سحر و شام پکا کرتا ہے
....

تم ہو نقاد کہ ہو غم کے پرکھنے والے
حیف سینوں کی حرارت تمھیں معلوم نہیں
حیف ماحول کی حدت تمھیں معلوم نہیں
خنکی قطرۂ شبنم کے پرکھنے والے
....

تپش قطرۂ شبنم کی خبر ہو تو کہو
عارض گل میں بھی شعلوں کی لپک ہوتی ہے
اشک نرگس میں سلگنے کی لہک ہوتی ہے
آتشِ دیدۂ پرنم کی خبر ہو تو کہو
....

کس طرح گرم ہواؤں سے بھڑکتا ہے چراغ
کس طرح پیٹ کی بھٹی میں سلگتا ہے دماغ

یہ مجموعہ مطبع دی آزاد پریس، پٹنہ سے غالباً ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔

اجالوں کا حصار: یہ شعیب راہی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا کتابت شدہ مسودہ ۱۷۴ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ بھی محفوظ ہے۔ 'پیش لفظ' ڈاکٹر عبدالمغنی نے لکھا ہے اور 'تقریب' کے عنوان سے ڈاکٹر وہاب اشرفی نے شاعر اور اس کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔

شعیب راہی کی غزلیں قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہیں۔ ان کے ہاں روایت اور کلاسکیت کی قدر کے ساتھ جدید دور کے تقاضے کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں جن سے شعیب راہی کے منفرد غزلیہ آہنگ کا احساس ہوتا ہے:

یہ ان کا حکم ہے ہم وہ نہ لکھیں جو گزرتی ہے
گلا کٹوا کے بھی چھوڑیں نہ خنجر کی ثنا خوانی

یہ ممکن تو ہوا مجھ سے کہ میں نے اپنی جاں دیدی
نہیں ممکن ہوئی لیکن ستم گر کی ثنا خوانی

ہمیشہ اس نے کی تاریک راتوں کی طرف داری
ہمیشہ ہم نے کی روزِ منور کی ثنا خوانی

وہی جو بے ہنر ہے، بے ہنر کی مدح کرتا ہے
سخنور کرتے ہیں راہی سخنور کی ثنا خوانی
....

ہم تو تھے تدبیر کے قائل پابند تقدیر بنے
توڑا ہر زنجیر کو لیکن خود اپنی زنجیر بنے

اب تک جتنی شمعیں جلی ہیں شام جلیں تو صبح بجھیں
شمع کوئی ایسی تو جلاؤ، صبحوں کی تنویر بنے

ہم تو جھکے اخلاق کی خاطر اس نے خدا سمجھا خود کو
ہم تو کماں تھے لیکن راہیؔ وقت پڑا تو تیر بنے

شعیب راہی کی زیر نگرانی رانچی یونیورسٹی سے درج ذیل دو تحقیقی مقالے برائے پی ایچ۔ڈی منظور ہوئے۔ جن پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

۱۔عنوان: **اردو غزل میں تصور محبوب (میرؔ سے داغؔ تک)**
اسکالر: روشن آرا
سال: ۱۹۸۴ء
صفحات: ۲۶۶
ابواب کی تفصیل:
۱-اردو غزل کا عمومی پس منظر
۲-صوفی شعرا کی غزلوں میں تصور محبوب (پیکر تراشی)
۳-غیر صوفی شعرا کی غزلوں میں تصور محبوب (پیکر تراشی)
۴-اردو کی عشقیہ شاعری کا ایک بھرپور مطالعہ (اردو شاعری کے محبوب سے متعلق مختلف تعبیرات)
۵-عشقیہ شاعری میں جنسی عناصر کی تلاش اور اس کے سیاق وسباق میں تصور محبوب کا مکمل مطالعہ

۲-عنوان: **مہجور شمسی-حیات اور کارنامے**
اسکالر: شمیم ہاشمی
تحقیقی مقالے کی دیگر تفصیلات فراہم نہ ہوسکیں مگر یہ مقالہ طبع ہو چکا ہے۔

☆☆☆

Prof. Syed Hasan Abbas
Director Rampur Raza Library,
Hamid Manzil, Qila, Rampur,
U.P., Mob. 9839337979,
E-Mail: shabbas_05@yahoo.co.in

'خس وخاشاک زمانے'۔نو تاریخی پڑھت

نسیم عباس احمر

ادب، تاریخ اور کلچر کی ہم رشتگی ،تنقید کا ہمیشہ سے موضوع رہا ہے۔ادب، تاریخ اور کلچر کی تصویر ہوتا ہے۔کلچر، وہ ڈسکورس ہے جو اپنے عہد میں متن کی تشکیل کرتا ہے۔ اس ڈسکورس کی تشکیل میں معاشرتی ادارے، ریاستی، سماجی، سیاسی، عدالتی، تعلیمی اور مذہبی نظام کردار ادا کرتا ہے۔جس طرح یہ نظام یا طاقت کے مرکز بدلتے ہیں اسی طرح ڈسکورس بدلتا ہے۔نئی آوازیں مرتب ہوتی ہیں اور تغیر وتبدل رونما ہوتا ہے۔جس طرح کلچر وحدانی نہیں اس طرح تاریخ اور ادب بھی وحدانی نہیں ہوتا۔ادب، تاریخ اور کلچر کے رشتوں میں طاقت کے کھیل اور کلچر کے پیچھے ڈسکورس کے سلسلوں میں موجود خالی جگہوں، درزوں، خاموش آوازوں، دبے کچلے یا مخفی متن کے دوبارہ مطالعے کے لیے نو تاریخیت [۱] آگے بڑھتی ہے۔تاریخ کے دوسرے رُخ (غیر) یا جو تاریخ بیان ہونے سے رہ گئی، کو سامنے لاتی ہے۔طاقت کے کھیل کو بے نقاب کر کے ماضی کی تشکیل نو کرتی ہے۔تاریخ کی یہ نئی پڑھت طاقت اور سیاست کے لازمے کی بازآفرینی کے لیے بین المتونی تاریخ اُصولِ نقد سے کام لیتی ہے اور ایک سے زیادہ اختلاف یا اشتراک کو پیش کرتی ہے۔مختلف نظریات اور دعوؤں میں مشترک اقدار کی تلاش کرتی ہے۔ادبی متون کے علاوہ غیر ادبی متون کا مطالعہ کرتی ہے۔رائج ثقافتی روّیوں کو نئے معنی دیتی ہے۔تاریخ اور ادب میں سیاست کے دخل کو آشکار کرتی ہے۔

تاریخ کے متن کی اس نئی قرأت میں ایک عہد کے مختلف واقعات کو جداگانہ تقسیم کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے جو مسلّمہ اُصول خاص جبر کے تحت واقع ہوتے ہیں، انھیں اجاگر کرتی ہے۔ادبی متن کے سیاسی مطالعے کے ساتھ ساتھ دوسرے متون کے پس منظر کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ادیب کی زندگی پر دباؤ ڈالنے والے عناصر، خاندانی روایات، مذہبی اور نیم مذہبی عقائد و رسوم کا سراغ لگاتی ہے۔تاریخ کی متنیت اور متون کی تاریخیت کا دوسرا نام نو تاریخیت ہے۔

نو تاریخیت کے مطالعے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔گرین بلاٹ نے دو مختلف متون (ادبی وغیر ادبی) میں کارفرما مشترک تاریخی اور ثقافتی عناصر کی دریافت کا طریقہ اپنایا۔ریمنڈ ولیمز نے ایک متن میں کلچر کی تین صورتوں (حاوی، باقیاتی اور نوخیز کلچر) کے ذریعے ثقافتی بازیافت کی ہے۔تیسرا طریقہ جوناتھن ڈولی مور اور ایلن سن فیلڈ نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے متنی تجزیے، سیاسی اور تہذیبی متعلقات کی روشنی میں نظریاتی تفہیم کی صورت کیے ہیں۔

ذیل میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول 'خس و خاشاک زمانے' کا نو تاریخی تناظر میں مطالعہ پیش خدمت ہے۔یہ ناول ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ضخیم ناول تقسیم ہند سے پہلے شروع ہو کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دورانیے پر محیط ہے۔تاریخ، سیاست، سماج اور ثقافت کے تمام رنگوں کی جلوہ گری نے اسے اپنی مثال آپ بنا دیا ہے۔تین نسلوں کی کہانی کا لینڈ اسکیپ گوجرانوالہ کے اردگرد کا پنجاب، لاہور، نیویارک اور کینیڈا ہے۔اس طرح ناول کی کہانی پنجاب کی دھرتی اور ثقافت سے اُٹھتے ہوئے، تیسری دنیا کی شہری زندگی سے ہوتے ہوئے اعلیٰ دنیا کی تہذیب کو سمیٹے ہوئے ہے۔بیسویں اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کی تاریخ کے تمام واقعات و سانحات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے حوالے سے نئی قرأت اور متبادل بیانیے کی مثالیں پورے ناول میں ورق ورق پھیلی ہوئی ہیں۔

اس ناول میں زمانی ترتیب سے تاریخی وقوعات کی تعبیرات کو دیکھا جائے تو ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے بارے میں آرا سامنے آتی ہیں۔نوزائیدہ ملک میں مقامی مسلمانوں کو پہلی دفعہ حکومت کرنے کا موقع ملا۔اس آزاد مملکت کو چلانے میں ناکامی کا سبب یہ بھی رہا کہ مقامی مسلمانوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا چونکہ انگریزوں سے قبل ہندوستان پر جتنے مسلمانوں نے حکومت کی وہ باہر سے آئے اور وہ درآمد شدہ حکمران، مقامی مسلمانوں پر انحصار نہ کرتے تھے۔اپنے اس موقف کو بھارت میں قائم حکومت سے تقابل کر کے مقامی مسلمانوں کی نااہلی کو بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔

پاکستان اور بھارت ایک ہی وقت میں متحدہ ہندوستان سے الگ ہو کر مملکت بنے اور دونوں طرف کے مقامی باسیوں کو حکومت کرنے کا تجربہ نہ تھا۔ بھارت کے مقامیوں (ہندوؤں) نے صدیوں کی محرومیوں اور محکومیت سے سبق سیکھا اور اپنی سرزمین کو سگا جانا، اور پاکستان کے مقامیوں (مسلمانوں) نے سرزمین کو بیگانہ جانا اور خاکِ سمرقند و بخارا کو آنکھوں میں سرمہ جان کر لگاتے رہے اور ناکام رہے۔ہندوستان میں مسلمان حکومتوں کے مسلمان حکمرانوں کی مملکتوں کے بارے میں اظہار یوں کرتے ہیں:

''اس خطے کے مقامی مسلمانوں کے ہاتھوں میں کبھی حکمرانی کی باگ ڈور نہ آئی

تھی۔ وہ ایک نوعیت کے شودھر تھے کہ وہ جو سینکڑوں برسوں سے حکمران بادشاہتیں تھیں
اُن سب کے اہم ترین ستون ایران، طوران، ترکی، سمرقند، بخارا اور بغداد سے درآمد
ہوتے تھے۔ وہ لودھی، ابدالی، مغل یا غلام بادشاہ بھی مقامی مسلمانوں پر انحصار نہ کرتے
تھے۔ وہ سلطنت کے امور میں معمولی کل پرزے تو ہو سکتے تھے لیکن اس سطح سے بلند ہو کر
جہاں فیصلے ہوتے تھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ امیر کبیر اور صاحبِ
اختیار یہاں تک کہ ولی اللہ بھی باہر سے ایران، طوران سے درآمد کیے جاتے تھے۔'' [۲]

قیامِ پاکستان کے بعد انصاف پسند اور انسان پرست، منظم لیڈر قائداعظم کو جن دوستوں کا ساتھ ملا اُن کی بابت وہ بقول قائداعظم سب کے سب کھوٹے سکوں جو لوگوں کو ذلتوں سے مار دیتے ہیں، کا تذکرہ کیا ہے اور ان کھوٹے سکوں کا تقابل مسلم تاریخ کے حوالے سے کیا ہے کہ جب حضرت محمد (ص) کے انقلاب کے بعد یزید اور شمر جیسے لوگوں کے ہاتھ عنانِ حکومت آنے سے نقصانات ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک اور تاریخی تعبیر بھی کی ہے کہ برصغیر صرف انگریزوں کی حکمرانی کے دوران متحد کیا گیا تھا، وگرنہ اس کے خمیر میں تو انتشار رہے۔ نئی مملکت کے قیام کے فوری بعد مفاد پرستوں کی قبضہ گری اور الاٹمنٹوں کا پول بھی کئی مقامات پر کھولا گیا ہے۔ کھوٹے سکوں کا انجام کار، پہلا مارشل لاء جنرل ایوب کی حکومت ٹھہرا۔ اس ناول میں جنرل ایوب نے منافقت پر مبنی رویوں کی نشان دہی اس طرح کی ہے:

''کچھ روز بیشتر ایک وجیہ اور دراز قامت شخص کی آواز ریڈیو پر سنائی دی
تھی جس نے کسی بھی میدانِ جنگ میں اترے بغیر اپنی کابینہ کے مجبور کرنے پر
بادل نخواستہ فیلڈ مارشل کا عہدہ قبول کر لیا تھا اور ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ کرسٹین کیلر نامی
طوائف کی ننگی ٹانگوں کو ایک سوئمنگ پول میں سہلاتا تھا، اب اپنے وزیر اطلاعات کی لکھی
ہوئی تقریر پڑھ رہا تھا۔'' [۳]

اُنھوں نے ۶۵ء کی جنگ کو خود فریب جنگ قرار دیا ہے۔ اسے قوم کے محب الوطن کا فریب بھی کہا جو خالی ہاتھوں واہگہ کی جانب دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے، ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے رواں ہے۔ جس جنگ میں اسلحہ ختم ہونے کا اعتراف کیا جا رہا ہو، وہاں خالی ہاتھ جنگ کرنے کا فریب بھی اجاگر ہوا ہے۔ وہ اس جنگ کو ایسا رومان کہتے ہیں جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو فلرٹ کر رہے تھے۔ جنگ کی تباہ کاریوں سے ناآشنا فریق، اگر یہی جنگ سترہ دنوں کی بجائے سترہ مہینے لڑتے تو لاہور اور دلّی کا حال، جنگ کے دنوں کے لینن گراڈ، برلن اور لندن جیسا ہوتا تو رومان سے حقیقت کا سفر ممکن ہوتا۔ اس دل فریب معصوم جنگ میں

رومان پرور ہیجان خیز ملّی نغموں اور مذہبی خود فریبی کو بھی فریقین کی حقیقت ناآشنائی گردانا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ اس ناول میں اس سانحے پر کئی صفحات میں محرکات، واقعات اور مابعد اثرات کو سمیٹا گیا ہے۔ پاکستانی فوج اور بنگالی عوام کی کشاکش کے حوالے سے اصل حقائق تک رسائی اس وقت مشکل ہو جاتی ہے جب دونوں فریقوں کو قصوروار ٹھہرا کر بری الذّمہ ہوا جاتا ہے۔ محمود کرمن کمیشن کی رپورٹ کے بعد بہت سے حقائق طشت از بام ہوئے ہیں۔ مذکورہ ناول میں پاکستانی فوج کے بنگالی عوام پر ظلم کی داستان، مذہب کے نام پر موسیقی، شاعری اور زبان سے رغبت رکھنے والے عوام کا گلا گھونٹنے کا بیان، مکتی باہنی کو ہندوستان کی تربیت اور مہلک ترین ہتھیاروں کی ترسیل کا بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر سکھوں نے جس طرح مسلم عورتوں کے ساتھ زیادتیاں کیں بعینہٖ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجیوں نے بھی مسلم عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، ان واقعات کے بیان کے لیے بخت جہاں کا سہارا لیا گیا ہے اور اس واقعے کا شکار مقدس بانو کا کردار ہے، جسے بعد از آں کینیڈا میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ اس جنگ میں صرف انسان دشمن نہیں ہوئے بلکہ بنگال کی دھرتی کی ہر شے دشمن ہو گئی۔ سلہٹ کے چائے کے باغ، برہم پتر کے پانی، نواکھلی کے کھیت، خلیج بنگال کے ساحل، سندر بن کا ہر شجر، بن میں مہندی رنگے جانوروں کی ہر آنکھ، تالاب کی ہر مچھلی، بانس کے جھونپڑوں کی مسجدوں سے بلند ہونے والی اذانیں، سب دشمن ہو گئے۔ ہر طرف سے نفرت نظر آ رہی تھی جو کہ ظلم کے ردّ عمل میں اُبھری تھی۔ جنرل یحییٰ کی عیاشی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی قید اور سانحے کے ذمہ دار کا تعین دیکھیے:

''جب مردہ پرندے چھتوں پر گر رہے تھے تو دارالسلطنت کی رات میں خمار
سے حواس باختہ ایک شخص برہنہ حالت میں بھاگتا چلا جا رہا تھا اور اُس کے جلو میں
صدارتی محافظوں کی درجنوں جیپیں ہوٹر بجاتی اس کی حفاظت کے لیے چلی آتی ہیں اور
اُن جیپوں میں اس شخص کے جسے ایک مذہبی جماعت نے نمازی قرار دیا تھا چند سوٹ ہیں
تاکہ وہ اپنے تن کو اُن سے ڈھک سکے، وہ بہ مشکل ان کے قابو میں آتا ہے اور نعرہ لگاتا
ہے۔ جنگ جاری رہے گی، وہ بے چارہ شخص ایک بہانہ تھا، سارے جرم اس کے کھاتے
میں ڈال دیے گئے اور پوری قوم بری الذمہ ہو گئی۔ جب کہ قوم کا ہر فرد اُس جرم میں نہ
صرف شریک تھا بلکہ فخر کرتا تھا کہ تھینک گاڈ...... پاکستان بچ گیا۔ ع:- اسلام زندہ ہوتا
ہے ہر کربلا کے بعد'' [۴]

اس ناول میں جنرل نیازی کے دستخط کرنے کی کارروائی اور پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی ذلت

کا بیان بھی ملتا ہے۔ اس واقعے کے لیے سپاہی فتح محمد کی آپ بیتی سے مدد لی گئی ہے۔ اس تاریخی ہزیمتوں اور شکستوں میں سرکاری خبروں اور ترجمانوں کے مذہب اور ملت کے نام پر فریب کاریوں اور خارشیوں کی قلعی اس طرح کھولی گئی ہے:

''اللہ دتہ شیخ ابھی روتا ہوا آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان ریڈیو پر تو منڈیوں کے بھاؤ نشر ہو رہے ہیں، ملّی نغمے گائے جا رہے ہیں...... جاگ اٹھا ہے سارا وطن اور اے مردِ مجاہد جاگ ذرا۔ لیکن بی بی سی ریڈیو بار بار خبر دے رہا ہے کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ آکاش وانی پر بھی یہی خبریں چل رہی ہیں۔''[۵]

تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ عوامی رومان کے علاوہ اُس کے مظالم کی تصویریں بھی اس ناول میں اجاگر کی گئی ہیں۔ اُن کی خدمات کے ذکر میں ہندوستان کے طول وعرض میں قید پاکستانی فوجیوں کی رہائی کے معاہدے کی کامیابی کو بھٹو کی فراست کا نتیجہ گردانا ہے۔ عوام میں بھٹو کے سحر کے اعتراف کے باوجود اُن کی شخصیت کے دوسرے پہلو کو اس طرح واضح کیا ہے:

''وہ ایک اور آمر تھا جو اپنی نخوت اور جاگیردارانہ تکبر سے نجات حاصل نہ کر سکا، نہ صرف اپنے معتبر ساتھیوں بلکہ مخالفوں کو بھی جس طور اس نے ذلیل کیا۔ جوہڑوں میں ڈبویا، تھانوں میں اُن کے ساتھ جو بدفعلیاں کی گئیں، الیکشن کے دوران جیسے اُس کا وزیر قانون بیلٹ بوکس کو بغل میں دبا کر پولنگ اسٹیشن سے باہر آتا کلاشنکوف لہرا رہا ہے۔''[۶]

ضیا کے مارشل لا اور بھٹو کی پھانسی بھی پاکستان کی تاریخ کے سیاہ ابواب ہیں جس پر تارڑ نے بھی قلم فرسائی کی ہے۔ اس کے بیان کے لیے، انھوں نے امیر بخش کے دو بیٹوں انعام اللہ اور روشن کو چنا ہے۔ انعام اللہ ایک مصنف اور روشن صحافی ہے۔ انعام اللہ نے اپنی سیاسی تحریر میں بھٹو کے ختنہ (مسلمان) ہونے یا نہ ہونے کی معلومات کے لیے، ضیا کی میت کے معائنے کی حقیقت کو فاش کیا اور اس کے ناول 'ایک حرامی کی سرگزشت' کی اشاعت پر گستاخ اور کفر کے فتوؤں کے ذریعے ضیا دور کے مصنفین اور دانشوروں پر جبر وستم اور ملک بدر کرنے کے ظلم کی داستان کو رقم کیا ہے۔ روشن (صحافی) پر پانچ سالہ صدارت کے لیے بوگس ریفرنڈم پر تنقید کے نتیجے میں گرفتاری اور مقدمے کے بیان کے ذریعے ضیا دور کے ثمرات پیش کیے گئے ہیں۔ ضیا نے پاکستان میں اسلام رائج کرنے کے لیے فوجی عدالتوں کے ذریعے شاہی قلعے کے زنداں سے خوب کام لیا۔ وہ ضیا الحق کے لیے مردہ مینڈک کی متحرک آنکھیں استعمال کرتے ہیں، اور اُس کے سامنے کے تین دانت جھڑنے سے پیدا شدہ خلا کو اُس کی دہشت کا حربہ قرار دیتے ہیں، جس سے اُس کے

ساتھی جنرل، خوشامدی سیاست داں اور عالم دین، جن کی وفاداری پر اسے ہر وقت شک رہتا تھا، زرد چہرہ لیے رہتے تھے۔ افغانستان کی جنگ نے اُس کے نصیب جگا دیئے اور اُس نے امریکی بتیسی لگوائی جس کی مسکراہٹ دین دار حواریوں کو مونا لیزا کے ہم پلہ لگتی تھی۔ اُس کی شخصی منافقت اس وقت سامنے آئی جب اس نے ہندوستان میں فلم اسٹار ہیما مالنی سے ملاقات کی خواہش کی۔ تارڑ نے ضیا دور کی سزاؤں اور مظالم کا کھل کر اظہار کیا۔ ضیا دَور کے ثمرات میں فوج، بیوروکریسی، سیاست اور مدرسوں میں لگائی گئی سبزی (نرسیاں) کا ذکر بھی کیا ہے جو سب اب تناور درخت بن چکے ہیں۔ ضیا دور کی سزاؤں کے حربوں کی تاریخ رقم کی ہے اور اس ظلم کو انگریز دَور کے ظلم کے تسلسل کی ایک صورت اور ماڈل کے طور پر نمایاں کیا گیا ہے:

''ملک بھر کے زندانوں میں انگریز سرکار کی استعمال شدہ اور کب کی متروک ہو چکی ایسی ٹکٹکیاں کچی کوٹھریوں میں پڑی تھیں اور انھیں گھن لگ چکی تھی اور ان میں سے چند ایک جو ابھی تھوڑی مرمت کے بعد استعمال کے قابل تھیں وہ کافی نہ تھیں۔ مشاق اور کاریگر ترکھانوں کو انہی ٹکٹکیوں کو ماڈل کے طور پر سامنے رکھ کر نئی نکور صلیب نما ٹکٹکیاں بنانے پر مامور کر دیا گیا اور دن رات کی محنت شاقہ کے باوجود ہدف پورا نہ ہوتا تھا۔ کم از کم ساٹھ ہزار سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور ادیبوں اور عام شہریوں کو دُرّے مارنے کے لیے وہ ناکافی ثابت ہو رہی تھیں۔''[۷]

کردار انعام اللہ کے ناول 'آٹو بائیوگرافی آف اے باسٹرڈ' سے استفادہ کرتے ہوئے افغان مجاہدین کی روسی جنگ میں شرکت، مجاہدین کی درندگی اور جہادیوں کی آپسی تفرقہ بازی کو شامل ناول کیا ہے۔ روس کے خلاف جنگ میں احمد شاہ مسعود کا ساتھ دینے والا اپنی داستان رقم کرتا ہے۔ بعد ازآں احمد شاہ مسعود جو روسی جنگ میں افغان مجاہد اور لیڈر تھا، اُسے سعودی مجاہد اور لیڈر اُسامہ بن لادن صرف اس لیے ہلاک کروا دیتا ہے کہ احمد شاہ مسعود شیعہ تھا اور اُسامہ وہابی تھا۔ تارڑ نے افغان جہاد میں شریک مجاہدین کی فرقہ پرستی کی بھی قلعی کھول دی ہے۔ بعد ازآں روسی جنگ سے فراغت کے بعد نجیب اللہ کے دور کے ہنستے بستے کابل شہر میں اقتدار کی جنگ میں، وہی افغان مجاہدین اپنے ہم مذہبوں اور ہم مسلکوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ کابل کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ نہ صرف گھر بار لوٹے بلکہ عزتیں بھی پامال کیں، ہزاروں لڑکیاں حاملہ ہوئیں۔ روس جنگ کے دوران امریکا کے دروازے ہر افغان کے لیے کھلے تھے اور سیاسی پناہ حاصل کرنے میں بھی دشواری نہ تھی۔ تارڑ نے ٹریڈ سنٹر پر حملہ کرنے والے غیر شرعی مسلمانوں کی تفصیل کچھ یوں بیان کی ہے:

''ورلڈ ٹریڈ ٹاورز...... پینٹاگن اور وہائٹ ہاؤس کے متکبر معبدوں کو مسمار کرنے کی نیت رکھنے والے جو جیٹ طیارے ان کی جانب بڑھتے تھے انھیں اغوا کرنے والے قطعی طور پر شریعت کے پابند مسلمان نہ تھے۔ اُن میں سے ایک عادی شرابی تھا اور اپنی ترک محبوبہ کے ہمراہ جرمنی میں رہائش پذیر تھا اور دوسرا......عطا...... وہ بھی نائٹ کلبوں اور شراب کا رسیا تھا۔ چنانچہ اس خودکشی میں عقیدے کا کچھ عمل دخل نہ تھا۔ یہ مسلسل بے توقیری اور ناانصافی کے گھاؤ تھے جو اس کا سبب بنے تھے۔''[۸]

۹/۱۱ کے اثرات پاکستان پر بھی پڑے اور مشرف دَوران اثرات کا براہِ راست غماز ہے۔ امریکا کے آگے سرنڈر کرنے کے انداز اور سابقہ جرنیلوں کے تسلسل کی کڑیوں کو کچھ یوں ملایا گیا ہے۔

''نصف شب کی قربت میں جب ایک کمانڈو جنرل جس کی جرأت اور شجاعت کا کچھ حساب نہ تھا ہڑ بڑا کر اپنے بستر سے اٹھتا ہے اور فون اٹھا کر اپنے شب خوابی کے لباس کے پاجامے کا ازار بند تھامتا اٹھتا ہے تو اٹینشن ہو جاتا ہے یس سر......ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

اس نوعیت کے جتنے بھی شیر دل جنرل ہوتے ہیں سیسہ پلائے ہوئے دماغ کے ہوتے ہیں کہ ان میں کچھ لچک نہیں ہوتی، کچھ اثر نہیں ہوتا البتہ اُن کے پاؤں ہمیشہ کچی مٹی کے بنے ہوتے ہیں ان پر اگر دھمکی کی ایک معمولی سی پھوار پڑ جائے تو وہ گیلے ہو جاتے ہیں......لیکن انعام اللہ کو ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ جنرل جو اتاترک کو اپنا رول ماڈل ماننے کے بعد...... اپنے پیارے کتوں کے ساتھ تصویریں اتروانے کے بعد جوق در جوق اپنے در پر حاضر ہونے والے مقدس چہروں اور چوہدریوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لے گا، وہ اپنے جیک آباد اور پشاور کو بھی رہن رکھ دے گا...... یہ جنرل کبھی خود سے نہیں اُٹھتے، ہمیشہ اُٹھائے جاتے ہیں۔''[۹]

ملک میں مستقل مزاجی سے آنے والے مارشل لا اور فوجی جرنیلوں کے منافقانہ طرزِ عمل اور کبھی عقیدے اور کبھی طاقت کے آگے ملک کو رہن رکھنے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ جمہوریت کے تسلسل میں مسلسل رکاوٹ اور مسخ شدہ حقائق کے بیان کی نئی تعبیر کی گئی ہے۔ پاکستانی سیاست دانوں کی دوعملیوں کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ دوہری شہریت حاصل کرنے کے لیے اقلیتی فرقے کے فرد کے طور پر سیاسی پناہ کے لیے درخواست دیتے ہیں۔ کینیڈا کی شہریت حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں

بیٹھ کر بے روزگاری الاؤنس بھی وصول کریں گے اور عوام الناس کو حب الوطنی اور مستقبل سے مایوس نہ ہونے کا درس بھی دیں گے۔

۹/۱۱ کی افغان جنگ لڑنے والوں کے بارے میں حقائق بھی پیش کیے ہیں کہ لڑنے والے غیر افغان ہیں۔ عرب، قازق، پاکستان اور چینی ہیں۔ جہاں اُنھوں نے اس جنگ میں افغانی عوام کے ردِعمل کو بھی نمایاں کیا ہے جو ان دور دراز سے لڑنے کے لیے آنے والوں کی قبروں پر چاول بکھیر کر اور مٹی آلود چاولوں کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کیوں کہ وہ انھیں ولی اللہ کا درجہ دیتے ہیں۔ جارج بش اور امریکی میڈیا کی پروپیگنڈہ مشینری کے پیدا کردہ روبوٹس اور چند دہائیاں قبل امریکیوں کے تیار کردہ مجاہدین جیسے روبوٹس سے تقابل کر کے امریکیوں کے کردار کو اس طرح آشکار کیا ہے:

''جمہوریت، تہذیب اور آزادی کے دشمنوں کے جو چہرے ٹیلی وژن سکرین پر چسپاں چلے جاتے تھے ان میں ایک قدر مشترک تھی، وہ سب کے سب موزلم تھے، تمام موزلم ٹیررسٹ نہیں لیکن تمام ٹیررسٹ موزلم ہیں۔ چنانچہ میڈیا اور انتظامیہ نے ان کے بدنی نظام کے کمپیوٹر میں نفرت اور شک کا جو ڈیٹا بھر دیا تھا اُس کے زیر اثر وہ روبوٹس ہوگئے تھے۔ یوں وہ ان روبوٹس سے چنداں مختلف نہ تھے جن کی پنیری امریکا کے مرغوب ترین افغان جہاد کے دوران پاکستان میں اکھوڑہ، خٹک، کراچی اور وزیرستان وغیرہ کے دینی مدرسوں میں بوئی گئی تھی۔ اس کی نگہداشت پر علمائے کرام مامور تھے لیکن اس کی معاشی آبیاری کی ذمہ داری سی آئی اے تھی۔''[۱۰]

تارڑ نے ناول میں امریکا کی جنگوں میں اہم کردار کا محرک اس کی معاشی اجارہ داری کی خواہش کو قرار دیا ہے۔ افغان جنگ کے بعد عراق جنگ اسی کھیل کا حصہ ہے۔ عراق جنگ، زرخیز تیل کے کنوؤں کے تعاقب میں کی گئی۔ امریکیوں کے ساتھ عراقیوں کی خصلت کو بھی آشکار کیا ہے جنھوں نے پہلے صدام جیسے آمر کے منہ پر جوتے مارے اور کچھ برس بعد وہ امریکی صدر پر جوتا پھینکتے ہیں۔ وہ امریکہ میں دو جدید عمارتوں کے بدلے پوری تہذیب انسانی کے کچلنے کو مناسب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح وہ اسرائیلی ٹینک کے سامنے کھڑے مٹھی میں پتھر بھینچے بچے کی مزاحمت کو بھی اجاگر کرتے ہیں جو طاقتوروں کی دوعملی اور منافقت کے اظہاریے ہیں۔ تارڑ نے بغداد کی تاریخ میں واقعاتی مماثلتوں سے عراق جنگ سے تہذیبی تباہی کی وضاحت کی ہے۔ بنوامیہ، عباسی، منگول، ترک، برطانوی اور امریکی تسلّط کی داستان بیان کی ہے۔ منگولوں نے لاکھوں کتابوں کو نذرِ آتش کیا۔ اب قرآن پاک کے قدیم ترین نسخوں کی راکھ، پانچ ہزار برس پرانے خودساباد کے اسیرین قعر

میں موجود مجسمے اور مہریں، نینوا کے مرتبان، بابل کے ظروف، اپالو کے مجسمے کرچیوں میں ڈھل گئے، عراق جنگ کے خلاف امریکیوں کے ردِعمل اور امریکا (طاقت) کی نئی چالوں کا پتا یوں دیتے ہیں:

''بوڑھے ریٹائر ہو چکے امریکی فوجی اپنی لرزتی ہوئی آواز میں مطالبہ کر رہے ہیں۔ برنگ بیک آور بوائز فرام عراق۔ وہائٹ ہاؤس کے سامنے ایک جمِ غفیر۔ بش ایک جنگی مجرم ہے۔ اس پر جنگی جرائم کا مقدمہ چلایا جائے...... اس جنگ کا انجام کیا ہونا تھا۔ کیا ویتنام کی مانند بالآخر کوئی نئے برس کا ٹیٹ اوفنسو ہوگا جس کی شدت سے امریکی فوج کے قہر کی کمر ٹوٹ جائے گی اور ان کے فرار کا واحد راستہ سائیگان کے امریکی سفارت خانے کی چھت رہ جائے گی، جہاں سے ہر دو سکینڈ کے بعد ایک ہیلی کاپٹر امریکی افسروں اور ان کے حواری ویتنامی جنرلوں کو اپنی پناہ میں لے کر اڑان بھرے گا...... شاید ایسا اس بار نہ ہو کہ وہ اپنے پچھلے تجربوں سے بہت کچھ سیکھ چکے تھے شاید وہ کُرد اور شیعہ کارڈ کھیل کر وہاں کچھ عرصہ تک قدم جمائے رکھیں۔''[۱۱]

امریکہ کی ویتنام میں شکست کی تاریخ سے تقابل کر کے عراق جنگ میں اُن کی نئی چالوں کو نمایاں کیا ہے۔ 'خس و خاشاک زمانے' میں پاکستان اور بین الاقوامی تاریخ کے بارے میں نئی تفہیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں درآمد شدہ مسلم حکمرانوں کے علاوہ مقامی سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی مسلم دوستی اور انگریز حکمرانوں کے کارناموں کے ذریعے تاریخ کے 'غیر' یا 'دوسرے' کو واضح کیا ہے۔ رنجیت سنگھ، مہارانی موراں کے ساتھ مسجد وزیر خاں میں شراب نوشی کرتا تھا اور جب بزرگ کی بددعا سے جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوا تو تائب ہو کر مسجد وزیر خاں کو نماز کے لیے کھول دیتا ہے بلکہ اندرون شہر میں ایک شان دار مسجد 'کنجری مسجد' تعمیر کرواتا ہے۔ یہ وہ مسجد ہے جس میں مسلمان اس لیے نماز نہیں پڑھتے کہ اس کا نام کنجری کی مسجد ہے۔
ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کی خدمات کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''ان ناتواں اکثر ننگ دھڑنگ...... دھوتیوں...... شلواروں اور چُست پاجاموں والے سازشی ہندوستانیوں کا کیا پتا کہ کب بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ امیر بخش کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ آخر کوئی بھی ایسی سرکار برطانیہ کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے جس نے پشاور سے کلکتے تک ریل کی پٹری بچھا دی۔ پنجاب میں درجنوں نہریں کھدوائیں جن کے پانیوں سے ویرانے آباد ہو گئے۔ دریاؤں پر پل تعمیر کیے۔ ڈاک کے ہرکارے دوڑائے، سڑکوں کے جال پھیلائے، سکول، کالج اور ہسپتال بنائے...... بلکہ قانون پاس

کر دیا کہ زرعی زمین کی ملکیت کا حق صرف جاٹ کاشتکاروں کو حاصل ہے۔''[۱۲]

ہندوستان میں انگریزوں کی ان خدمات کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے بنگلوں کی تعمیر کے لیے مساجد کی مسماری کا تذکرہ کیا ہے۔ پکی اینٹوں کے حصول کے لیے مغلیہ عہد کی تاریخی مساجد کو مسمار کیا گیا۔ انگریزوں کے سرکاری قوانین میں ہندوستانیوں کے ساتھ ناانصافیوں کا بھی اظہار کیا ہے۔ مقامی ہندوستانی جاٹ اور دیگر ذاتیں قانون کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتے تھے مگر انگریز گیزیٹرز میں ان ذاتوں اور قبیلوں کو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث قبیلہ قرار دیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اس ناول میں طاقت کے کھیل اور اُصولوں کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ طاقتوروں کے بارے میں رویہ بھی اہم ہے۔ وہ ادب کو ظلم کے راستے میں حائل رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا تصور اس طرح واضح ہوتا ہے:

''یہ بھی محض خام خیالیاں ہیں۔ شباہت کا ادب ظلم کا راستہ روک سکتا ہے۔ لکھے گئے حرف میں سے انصاف کے چشمے پھوٹ سکتے ہیں...... نہیں ادب بھی خود کو بری الذمہ قرار دینے کی ایک انٹلکچوئل ماسٹربیشن ہے...... جس سے فارغ ہو کر آپ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا...... اور یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ ہم اس نوعیت کی ماسٹربیشن میں مشغول رہیں، ناول تحریر کریں، مزاحمتی ادب تخلیق کریں، رُلا دینے والے مرثیے لکھیں...... یوں انھیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتی لیکن ہم اس عمل کے نتیجے میں ناتواں ہوتے چلے جاتے ہیں۔''[۱۳]

وہ ذات، عقیدہ یا مذہب کو طاقتوروں کی چال اور گڑھی ہوئی داستانیں اور جھوٹ کے دلاسے سمجھتے ہیں۔ وہ سچ کو کسی ایک مذہب کی جاگیر نہیں سمجھتے بلکہ اسے ذرّوں میں بکھرا ہوا کہتے ہیں اور مذہب کو زورآوروں کا حاکمیت قائم رکھنے کا ڈھکوسلہ قرار دیتے ہیں۔ ذات اور عقیدے کے ساتھ ساتھ وطن کو بھی نابینا تلوار کہتے ہیں، جو ملک، مذہب کی بنیاد پر قائم ہو، وہ زیادہ دیر تک ثقافت اور زبان کی یلغار نہیں سہ سکتا۔ اس کے لیے بنگلہ دیش کے قیام کی مثال دیتے ہیں۔ مذہب اور بھوک کے تقابل میں اُن کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''حلال اور حرام کی تمیز کے اندر صرف بھوک اور ناداری ہے۔ اس سے باہر ہو جاؤ تو سارے دروازے کھلے ہیں۔ یہاں نہایت مومن مسلمان اپنے سٹورز پر وائن کی بوتلیں اہتمام سے سجاتے ہیں اور کھلا نہیں پیک شدہ منجمد خنزیر کا گوشت فروخت کرنے کے حق میں فتوے حاصل کر چکے ہیں۔ تو میں...... یہیں گرین اِچ ویلیج میں

’رین بوسٹو‘ نام کی ایک ایسی دکان چلاتا ہوں جو صرف ہم جنس پرست لوگوں کے لباسوں،
میک اپ کے سامان......زیورات اور زیر جامہ وغیرہ کے لیے مخصوص ہے۔‘‘[۱۴]

مذہبی منافقت اور منافرت کے ساتھ ساتھ نو دولتیوں اور مفاد پرستوں کی پاکستان میں حکمرانی کا تذکرہ بہت سے مقامات پر ملتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سے انگریزوں کی جوتیاں چومنے والے رسّہ گیر، طوائفوں کی اولاد جاگیردار اور نواب زادے بن گئے۔ مذہب کے نام پر انتشار پھیلانے کے لیے داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُن کے پیچھے منافرت کا پرچار کرنے لگے اور یہی مذہبی تعصب ملکی آزادی میں رکاوٹ ہے۔ نیا ملک جو پاک لوگوں کا ستان تھا اس میں ناپاک بھی پاک ہوئے۔ وہ مذہب سے زیادہ زمین کو اہمیت دیتے ہیں۔ جب تقسیم ہوئی تو بہت سے نکّی سردار (سکھ) اور گوجر خان کے قریب کے ایک گاؤں کے سارے سکھ اس لیے مسلمان ہو گئے کہ وہ اپنی مٹی اور زمین کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں مشترکہ تاریخی ورثے اور متحدہ ثقافت کے داعی ہیں۔

’’یہ دراوڑوں کی دھرتی ہے۔ آریاؤں کی سرزمین ہے۔ گندھارا کے نام سے
پہچانی جاتی ہے۔ ہندو شاہی ہے۔ مغل راج ہے۔ سکھا شاہی ہے۔ انگریز حکومت ہے یا
ایک مملکت خداداد ہے، اُسے کچھ پروا نہ تھی۔‘‘[۱۵]

تہذیب وثقافت کے عمل میں مختلف اعمال وافکار کی توجیہات بھی سامنے آتی ہیں۔ امرد پرستی اور ہم جنس پرستی، جسم فروشی، ہندو ساہو کاروں کا رویہ، لکھنو کی بولی پر سانس کے اثرات، نبی کے کارٹون، تخلیق کاروں کے حربے بنانا اہم ہیں۔ انھوں نے یورپ میں ہم جنس پرستی کے رجحان کو ہزاروں برس سے فارسی اُردو شاعری اور تصوف میں رائج امرد پرستی کے تصور کی توسیع قرار دیا ہے اور جو دلائل دیے ہیں وہ یہ ہیں کہ شاہ حسین اور مادھولال، مولانا روم اور شمس تبریز کی طرح ایک دوسرے کے لیے بے چین ہوتے تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک بزرگ کے عرس کے موقع پر لڑکوں کا مقابلۂ حسن کروایا جاتا ہے۔ بتّوں کے ماہر اُستاد نوخیز لڑکوں کو رقص کی تربیت دیتے ہیں، حتیٰ کہ جنت میں حوروں کے ساتھ غلمان کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے گہرے صدمے کے مداوے کو جنسی اختلاط میں پنہاں قرار دیتے ہوئے نوستمبر کے بعد جنسی قربت کے لیے ہیجان خیزی، بدن فروش طوائفوں کے چمکتے کاروبار سے اس کی مثال دی ہے۔

مشترکہ ہندوستان میں ہندو ساہو کاروں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ہندو ساہو کاروں کے بارے میں یہ رائج تصور ہے کہ وہ برے لوگ تھے۔ تارڑ نے انھیں ایمان دار لوگ اور بہی کھاتوں کے پکے گردانا ہے۔ وہ جاٹوں کے اجڈ پن سے واقف ہونے کے باوجود اُس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے تھے بلکہ

اکثر درست مشورے دیتے تھے کہ اپنی زمین گروی نہ رکھو، شادی پر زیادہ خرچ نہ کرو۔ وہ لکھنو کی بولی پر سانسی زبان کے اثرات کے بارے میں بھی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھنو کی بولی میں ’اُس نے‘ کی بجائے ’اُن نے‘، ’جس نے‘ کی جگہ ’جن نے‘ جیسے الفاظ سانسی بولی سے مستعار ہیں۔ نبی کے کارٹون کی یورپ میں روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’یورپ میں لوگ، بیشتر لوگ مذہب کو کچھ زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے بلکہ اس کا
ٹھٹھا اڑانے میں بھی کچھ قباحت نہیں سمجھتے۔ عیسائیت کی بھی دھجیاں بکھیرتے رہتے ہیں
یہاں تک کہ ’کرائسٹ اے ہوموسیکسوئیل‘ نام کا ڈراما سٹیج پر پیش کر دیتے ہیں۔ کچھ اہل
کلیسا اور مذہب پرست احتجاج کرتے ہیں تو وہ انھیں خاطر میں نہیں لاتے۔ ’لاسٹ جج
منٹ آف کرائسٹ‘ جس میں اولیا کو برہنہ حالت میں دکھایا گیا ہے اور حضرت عیسیٰ
(ع) کو صلیب پر چڑھانے کے منظر میں نصرت فتح علی خان کا ایک پرسوز الاپ ہے۔
ایسی فلم بھی کھلے عام نمائش کے لیے پیش کر دی جاتی ہے کہ آزادیِ اظہار کی ان کے
نزدیک کوئی سرحدیں نہیں۔‘‘[۱۶]

انھوں نے نبی (ص) کے کارٹون کے احتجاج کے نتیجے میں عمرے اور حج کے انتظامات والی ایجنسی جن کے گودام میں ہزاروں قرآن پاک کے نسخے تھے، کو آگ لگائی گئی تو قرآنی اوراق لاہور کے آسمان پر راکھ کیسے گئے، کے احوال کو متبادل زاویے کے طور پر پیش کیا ہے۔

تارڑ نے تخلیق کاروں کے مختلف حربوں کو ناول کی زینت بنایا ہے۔ اِن حربوں میں ناول کا مواد مصنفین کی اپنی زندگی کے احوال بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اُنھوں نے عالمی ادب سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر تخلیق کار اپنے نزدیکی رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کے عشق کو بھی بیچ کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلمان رشدی تو اپنی ماں کے ٹیکس کو پک چکے بڑے آم سے تشبیہ دینے سے نہیں چوکتا۔

مندرجہ بالا تجزیے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کا ناول ’خس وخاشاک زمانے‘ میں بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کی تاریخ اور تہذیبی وقوعات کی نئی تفہیم پیش کی گئی ہے اور یہ ناول ادبی متن کے ساتھ ساتھ مذکورہ عہد کا متبادل تاریخی متن بھی ٹھہرتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی:

۱-یہ اصطلاح شمالی امریکہ میں گرین بلاٹ نے اسّی کی دہائی میں وضع کی۔دیگر نو تاریخی مفکرین میں جوناتھن گولڈ برگ، لوئی مونٹروس، لیونارڈ لینن ہاؤس، سٹیفن اورگل اور لسیا جارڈن شامل ہیں۔ برطانیہ میں نو تاریخیت کے لیے ’ثقافتی مادیت‘ کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ برطانیہ میں جن ناقدین نے اس حوالے سے لکھا اُن میں ریمنڈ ولیمز، جوتھن ڈولی مور، کیتھرین بیلس ، فرانسس بارکر اور ایلن سن فیلڈ اہم ہیں۔اُردو میں نو تاریخیت پر ریاض صدیقی، ناصر عباس نیّر، گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی اور پروفیسر عتیق اللہ نے لکھا ہے۔

۲-مستنصر حسین تارڑ،خس وخاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور ۲۰۱۰ء،ص ۴۲۳

۳-ایضاً،ص۳۴۶

۴-ایضاً،ص۳۸۸

۵-ایضاً،ص۴۰۱

۶-ایضاً،ص۴۱۶

۷-ایضاً،ص۴۱۶

۸-ایضاً،ص۵۰۴

۹-ایضاً،ص۵۱۰

۱۰-ایضاً،ص۵۰۶

۱۱-ایضاً،ص۶۶۱

۱۲-ایضاً،ص۱۲۶

۱۳-ایضاً،ص۶۸۶

۱۴-ایضاً،ص۴۴۹

۱۵-ایضاً،ص۴۰۳

۱۶-ایضاً،ص۶۴۱

☆☆☆

Dr. Naseem Abbas Ahmar
Assistant Professor in Urdu,
Sargodha University, Pakistan,
Mob. +923317617201
E-Mail: naseemahmar@hotmail.com

وہاب اشرفی کی کتابوں کے انتسابات اوران کی معنویت

محسن رضا رضوی

کسی کتاب کوکسی کے نام معنون کرنا ایک قدیم سلسلہ ہے۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ کس نے پہلی بار کسی کتاب کو کسی کے نام معنون کیا تھا۔اس سلسلے میں کوئی تحریر اب تک میری نگاہ سے نہیں گزری۔ چاہتا ہوں کہ اس باب میں تحقیق کی جائے اور ایک ایسی تحقیقی وتنقیدی کتاب سامنے آئے جس سے انتسابات کی کیفیتوں کا اندازہ ہوسکے۔ یہ ایک مشکل موضوع ہے جو تحقیق طلب ہے اور تفصیلی مباحث پر اکساتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں قلمبند کی ہیں۔ بیشتر کتابوں کے متعدد ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ چند کتابیں ایسی ہیں جو اردو تو کیا کسی دوسری ہندوستانی زبان میں موجود نہیں، مثلاً ’تاریخ ادبیات عالم‘ کی کوئی دوسری مثال ہندوستانی ادبیات میں نہیں ملتی۔خیر یہ تو ایک الگ بحث ہے، میں نے وہاب اشرفی کی کتابوں کے انتسابات پر غور کرنا شروع کیا تو ایک عالم خیال مجھ پر روشن ہوا کہ ہر کتاب کے انتساب کی اپنی معنویت اور اہمیت ہے، لہٰذا پروفیسر اشرفی کی جتنی کتابیں میسر آئیں میں نے ان کے انتسابات پر اپنے طور پر غور وفکر کیا ہے۔ایسے موضوع کا اطلاق دوسرے شعرا وادبا پر بھی کیا جاسکتا ہے، جن کی متعدد کتابیں ہیں اور مختلف لوگوں کے نام معنون کی گئی ہیں۔خود وہاب اشرفی کے نام بہت سی کتابیں معنون کی گئی ہیں جن پر ایک الگ مضمون لکھا جاسکتا ہے۔

وہاب اشرفی کے اطراف کھلے ہوئے اور متنوع ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ انھوں نے جس طرح اور جس کے نام کتاب معنون کی ہے، اس سے ابھرنے والی معنویت کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ذیل میں اس سلسلے کی تفصیل پیش کررہا ہوں۔

’تاریخ ادبیات عالم‘، جلد اول (۱۹۹۲ء)

والدۂ مرحومہ کے نام، اوران کی یاد میں:

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے
عقدۂ احکام پیغمبر کھلا

شعر کا انتخاب ایسا ہے جس سے ماں کی شفقت اور محبت کا پورا حال روشن ہو جاتا ہے۔

'تاریخ ادبیات عالم'، جلد دوم (۱۹۹۵ء)

بھیا سید عبدالجبار اشرفی کے نام:

بے تحاشہ کود پڑتے ہیں وفا کی آگ میں
ہم ہیں اس مٹی کے جس مٹی سے پروانہ بنا

وہاب اشرفی کی زندگی میں جب کبھی فیصلے کی کوئی گھڑی آئی، ان کے بھیا کے فیصلے ہی ان کے نزدیک مقدم اور قابلِ عمل ٹھہرے۔ پروفیسر اشرفی اپنے بھائی کی تمام تر باتیں مانتے رہے ہیں اور خود کو وفا کی آگ میں کود پڑنا کہتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وفا ایں و آں کا نام نہیں بلکہ خود سپردگی کی ایک منزل ہے جس سے پروفیسر اشرفی گزرے ہیں۔ گویا معنون شعر میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔

'تاریخ ادبیات عالم'، جلد سوم (۱۹۹۸ء)

پروفیسر آل احمد سرور کے نام:

مبارک است رفیق از چنیں بود غالب
ضیائے نیّر ما چشم روشنی دارد

آل احمد سرور کی تنقیدی حیثیت بلند و برتر ہے۔ انھوں نے تنقید کی متعدد جہات سے نئی نسل کو آشنا اور متاثر کیا ہے۔ تنقید کی ایسی بساط بچھائی کہ کلیم الدین احمد جیسے اہم نقاد نے ان کی نئی نگارشات کے حوالے سے لکھنا ضروری سمجھا۔ اس طرح آل احمد سرور نے اردو ادب میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ انھوں نے شعر بھی کہے، لیکن ان کی پذیرائی ان کی تنقید کے حوالے سے کی جاتی رہے گی۔ پروفیسر اشرفی نے جو شعر ان سے منسوب کیا ہے وہ ان کی معنویت کا احاطہ کر رہا ہے۔

'تاریخ ادبیات عالم'، جلد چہارم (۱۹۹۸ء)

علی سردار جعفری کے نام:

واماندہ در راہِ وفا از بےخودی ہا جا بہ جا
نقدم بہ منزل یک طرف، رختم بہ صحرا یک طرف

سردار جعفری ساری زندگی شعر و ادب سے وابستہ رہے۔ ان کی کارکردگی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی فعال شاعرانہ زندگی میں انھوں نے کتنے ہی ہفت خواں طے کیے اور امتیازات سے بھرپور زندگی گزاری۔ اعلیٰ انعام یافتہ ہوئے اور اپنی کارکردگی کے اعتبار سے فیض کے ہم پلہ قرار پائے، نیز نئی نسل کے لیے فضا ہموار کرتے رہے۔ پروفیسر اشرفی نے یہ جلد ان کے نام بہت عمدہ شعر کے ساتھ معنون کی ہے۔

'تاریخ ادبیات عالم'، جلد پنجم (۲۰۰۱ء)

محب مکرم وارث علوی کے نام:

تا درختِ دوستی بر کے دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

پروفیسر وہاب اشرفی جناب وارث علوی کو محب مکرم کہہ رہے ہیں اور ان کے انتقادی پہلوؤں کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ اس شعر میں بھی وہاب اشرفی کی خاکساری نمایاں ہے اور ان کی شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔

'تاریخ ادبیات عالم'، جلد ششم (۲۰۰۴ء)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام:

کسی کہ حسن رخ دوست در نظر دارد
محقق ست کہ او حاصل بصر دارد

پروفیسر نارنگ کے اپنے امتیازات ہیں۔ وہاب اشرفی صاحب ان کی دوستی کی تحسین کر رہے ہیں اور ایک ایسا شعر منتخب کیا ہے کہ وہ ہر شخص کی بصیرت کا سامان ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ وہ شخص صاحب نظر بھی ہو۔

'تاریخ ادبیات عالم'، جلد ہفتم (۲۰۰۵ء)

اپنے بیٹوں سید شکیل اشرفی، سید افروز اشرفی، سید انجم اشرفی اور سید شہیر اشرفی کے نام:
جنھیں یہ ادبی وراثت سنبھالنی ہے۔

'تاریخ ادبیات عالم' کی ساتویں اور آخری جلد پروفیسر اشرفی نے اپنے بیٹوں کے نام معنون کی ہے، اس ہدایت کے ساتھ کہ یہ ادبی وراثت اب انھیں سنبھالنا ہے۔

'کہانی کے روپ' (۱۹۷۹ء/ ۱۹۹۲ء)

شریک سفر زندگی نسیمہ اشرفی کے نام:

چوں روح رواں پاکم از چند و چگونِ تو
تو رازِ درونِ من، من رازِ درونِ تو

شریک سفر زندگی کے نام معنون یہ شعر خوب بھی ہے اور ازدواجی زندگی کی کلید بھی۔ اگر یہ نکتہ سب پر عیاں ہو تو وہ تلخی پیدا نہ ہو جو آج کی مادی زندگی کی شناخت ہے۔ مصنف کو اس شعر کے انتخاب کے لیے داد دی جانی چاہیے۔

'قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ' (۱۹۶۷ء/ ۱۹۷۷ء/ ۱۹۹۵ء)

والد محترم حاجی شاہ امام الدین مرحوم کے نام:

جن کی تعلیم و تربیت نے مجھے علم و ادب کا ذوق عطا کیا۔

وہاب اشرفی کی یہ پہلی کتاب ہے، اس لیے اس کو اپنے والد کے نام معنون کرنا عین فطری بات ہے جس کی وضاحت بھی موجود ہے۔

'شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری' (۱۹۷۵ء/ ۱۹۸۵ء/ ۱۹۹۴ء)

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی کے نام:

آں روز بر دلم درِ معنی گشادہ شد
کز ساکنانِ درگہ پیرِ مغاں شدم

پروفیسر عطا کاکوی وہاب اشرفی کے ہم وطن تھے۔ شاد عظیم آبادی کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عطا کاکوی ایک اچھے شاعر اور ذی علم شخصیت کے مالک تھے۔ تحقیقی امور میں بھی سر بلند رہے ہیں۔ وہاب اشرفی انھیں اپنا علمی محبوب بنا کر پیش کر رہے ہیں اور 'پیر مغاں' کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔

'راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری: اپنے دکھ مجھے دے دو کی روشنی میں' (۱۹۸۶ء/ ۱۹۹۴ء)

پروفیسر قمر رئیس کے نام:

جائے حضور و گلشن امن ست ایں سرائے
زیں در بشادمانی و عیش و طرب درآئے

اردو کے ممتاز ترین افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی سے متعلق یہ کتاب سر برآوردہ نقاد پروفیسر قمر رئیس کے نام معنون ہے، وہ فکشن پر بہت کچھ لکھ رہے تھے۔ یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ جائے شادمانی بھی ہے اور غم و اندوہ بھی۔ بیدی کے افسانوں میں بہت بھید بھاؤ ملتے ہیں، جن کی تفہیم ممکن ہے۔ اس اعتبار سے منتخبہ

انتساب کا شعر قابل تحسین ہے۔

'معنی کی تلاش' (۱۹۷۸ء/ ۱۹۹۵ء)

پروفیسر کلیم الدین احمد کے نام:

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

'معنی کی تلاش' پروفیسر اشرفی کا پہلا مجموعۂ مضامین ہے۔ کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے بہت سے پہلو اب تاریخی بن چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جیسے جیسے ادبی شعور ارتقا پذیر ہو رہا ہے کلیم صاحب پر تنقید بھی کی جا رہی ہے، لیکن انھوں نے جس طرح اردو تنقید کو ایک نئی کروٹ بخشی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کلیم الدین احمد کی نگارشات کے ضمن میں منتخبہ شعر ادبی حالات کے عین مطابق ہے۔

'آ گہی کا منظر نامہ' (۱۹۸۹ء/ ۱۹۹۱ء)

پروفیسر محمد حسن کے نام:

خیالِ قدِ بلندِ تو می کند دل من
تو دستِ کوتۂ من بیں و آستینِ دراز

پروفیسر وہاب اشرفی اکثر و بیشتر اس کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ پروفیسر محمد حسن ان کے واقعتاً اور عملاً محسن رہے ہیں، لہٰذا جو شعر موصوف نے ان کے لیے منتخب کیا ہے وہ محمد حسن کی عظمت اور وہاب اشرفی کی خاکساری کی طرف واضح اشارہ ہے۔

'حرف حرف آشنا' (۱۹۹۶ء)

شمس الرحمٰن فاروقی کے نام:

سر ایں نکتہ مگر شمع برآرد بہ زباں
ورنہ پروانہ ندارد ز سخن پروائے

کتاب کا نام، پھر شمس الرحمٰن فاروقی کے نام انتساب ان دونوں کے پس منظر میں منتخبہ شعر کی گہری معنویت پر نگاہ ڈالیے تو ایک جہان روشن ہے۔ خود وہاب اشرفی کا ادبی نقطۂ نظر بھی اس سے واضح ہو رہا ہے۔

'اردو فکشن اور تیسری آنکھ' (۱۹۹۷ء)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام:

از سر کوئے تو رفتن نتوانم گامے
ورنہ اندر دل بیدل سفرے نیست کہ نیست

پروفیسر گوپی چند نارنگ فکشن کے ایک ممتاز نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں، لہٰذا پروفیسر اشرفی نے اپنی اس کتاب کو موصوف کے نام معنون کیا ہے۔ شعر حسب حال ہے اور پوری کیفیت سمیٹے ہوئے ہے۔

'میر اور مثنویات میر' (۲۰۰۳ء)

عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے نام:

جلوہ گاہِ طائر اقبال گردد ہر کجا
سایہ اندازد ہمائے چتر گردوں سائے تو

پروفیسر اشرفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ گورنر اخلاق الرحمٰن قدوائی ان کے محسن رہے ہیں اور کئی مواقع پر ان کے معاون ثابت ہوئے ہیں، چنانچہ 'میر اور مثنویات میر' ان کے نام معنون کی گئی ہے اور ان کے تعاون کی توصیف کے علاوہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی پذیرائی کی گئی ہے۔

'کاشف الحقائق: ایک مطالعہ' (۲۰۰۴ء)

عزیزی ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے نام:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

امداد امام اثر کی مشہور کتاب 'کاشف الحقائق' کے حوالے سے پروفیسر اشرفی نے تفصیلی بحث کی ہے، ساتھ ہی متن بھی پیش کیا ہے۔ حقیقت ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد 'کاشف الحقائق' کی اہمیت کی تجدید کا کام سرانجام پایا ہے۔ یہ کتاب نئی نسل کے اہم نقاد ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے نام معنون ہے۔ شعر جوان کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ پروفیسر اشرفی اعجاز علی ارشد کی ادبی صلاحیتوں کی پیش بندی کر رہے ہیں۔

'مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات' (۲۰۰۴ء)

نئی نسل کے نام:

بہ زیر کنگرۂ کبریاش مرداں اند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

ترقی پسندی اور جدیدیت کی تحریکات کے بعد مابعد جدیدیت سامنے آئی۔ اس کتاب میں اس کے مضمرات وممکنات سے بحث کی گئی ہے۔ نئی نسل کے لیے پیغام ہے کہ وہ مابعد جدیدیت کے نکات سے آگاہ ہو، اور یہ بھی کہ نئی نسل اپنی قوت اور حوصلے کو سمجھے اس لیے کہ اب وہی سارے معاملات کی تفہیم کا حق اور حوصلہ رکھتی ہے۔

'معنی سے مصافحہ' (۲۰۰۵ء)

اختر پیامی کے نام:

کمال یوسفی اس سے عیاں ہے
عزیز خاطر اہل جہاں ہے

اختر پیامی جب ہندوستان میں تھے تو اپنے معاصرین مثلاً کلام حیدری، منظر شہاب اور انور عظیم وغیرہ سے ان کی گہری دوستی تھی اور وہ بہ اعتبار علم اور شاعر ممتاز ترین سمجھے جاتے تھے۔ پاکستان گئے تو وہاں بھی ان کا شمار اہم شاعروں اور صحافیوں میں ہونے لگا۔ وہاب اشرفی اپنے منتخبہ شعر سے ان کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

'تفہیم البلاغت' (۱۹۹۹ء/ ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر صدیق مجیبی کے نام:

بہ خوبی ہمچو مہ تابندہ باشی
بہ ملک دلبری پائندہ باشی

'تفہیم البلاغت' اپنی نوعیت میں اس لیے منفرد ہے کہ اس میں اردو کے بلاغت کے نظام کا انگریزی متبادل تلاش کیا گیا ہے۔ صدیق مجیبی اردو کے معتبر شاعر تھے اور بلاغت کے اصول سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس شعر سے ان کے امکانات کی توصیف کی گئی ہے۔

'تاریخ ادب اردو'، تین جلدیں (۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام:

ہزار شکر کہ دیدم بہ کام خویشت باز
ترا بہ کام خود و باتو خویش را دمساز

'تاریخ ادب اردو' دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اور تین جلدوں میں ہے۔ جمیل جالبی اپنی

تاریخ نویسی میں بے مثل ہیں، جس کا اظہار معنون شعر سے ہو رہا ہے۔ اس سے ادبی تاریخ نویس وہاب اشرفی کی کسر نفسی کا حال بھی روشن ہے۔

'معنی کی جبلت' (۲۰۰۸ء)

جواں مرگ شاعر اور قریب ترین دوست وکیل اختر مرحوم کی یاد میں:

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

وکیل اختر مرحوم یوں تو بہار کے تھے لیکن عہد طفلی سے کلکتہ میں رہے۔ وہ اس وقت وہاب اشرفی کے گہرے دوستوں میں تھے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے سایہ کی طرح رہتے تھے۔ (واضح ہو کہ اشرفی صاحب نے بی۔اے تک کی تعلیم کلکتہ ہی میں حاصل کی تھی) وکیل اختر کے کئی شعر زبان زد خاص و عام ہیں۔ مثلاً:

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا
اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا
....
جہالت کا عالم جو راہوں میں تھا
وہی بیش و کم درسگاہوں میں تھا

'قصہ بے سمت زندگی کا' (۲۰۰۸ء)

اپنے پوتے پوتیوں ذیشان، فرح، شایان، الحمرا، شاہان، شاذان، انشا، ہمشان کے نام:

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

'قصہ بے سمت زندگی کا' وہاب اشرفی کی خودنوشت ہے، جس میں زندگی کے احوال تمام تر نشیب و فراز کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ نئی پود کے لیے یہ کتاب گویا رہنما بننے کا امکان رکھتی ہے۔ پوتے پوتیوں کے نام اسی لیے کتاب منسوب کی گئی ہے۔

'نئی سمت کی آواز' (۲۰۱۰ء)

اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور دیرینہ دوست شفیع جاوید کے نام:
مظہر امام کے اس شعر کے ساتھ:

بڑا غرور تھا دونوں کو ہم نوائی پر

نگاہ اس کی تھی لیکن سرور میرا تھا

'نئی سمت کی آواز' وہاب اشرفی کا مجموعۂ مضامین ہے، یہاں اپنے پرانے دوست اور مشہور افسانہ نگار کے باب میں ان کے خلوص بے پایاں کا ذکر ہے، لیکن ایسے ذکر میں 'من تو شدم، تو من شدی' کا معاملہ پیش کیا گیا ہے۔ معنون شعر اپنے معنوی جہات کو بطریق احسن واضح کر رہا ہے۔

'تفہیم فکر و معنی' (۲۰۱۰ء)

اردو کے اہم شاعر، نقاد اور اچھے دوست پروفیسر لطف الرحمٰن کے نام

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بہ سجود

'تفہیم فکر و معنی' وہاب اشرفی کا مجموعۂ مضامین ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن ان کے معاصرین میں کئی پہلوؤں سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں، جس کا اظہار معنون شعر سے ہو رہا ہے۔ ذی علم لوگوں کی کمی اشرفی صاحب کو کھٹکتی رہی ہے، لیکن وہ لطف الرحمٰن صاحب کے علمی افق کو محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا منتخبہ شعر خوب ہے اور لطف الرحمٰن کو کھل کر داد دی گئی ہے۔

'مارکسی فلسفۂ اشتراکیت اور اردو ادب' (۲۰۱۰ء)

پروفیسر محمد حسن مرحوم کی یاد میں:

مارکسی نقاد پروفیسر محمد حسن کی ادبی کارگزاریاں قدر اول کا درجہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا یہ کتاب ان کے نام معنون کی گئی ہے۔

'قدیم ادبی تنقید' (۲۰۱۰ء)

تنقید کی نئی اور اہم آواز پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے نام:

اجازت پیشش یک دو حرف از درد دل گفتم
پس از دیرے کہ برخود عرصہ دارم داستانے را

اپنے ہمعصر نقاد ابوالکلام قاسمی کے نام قدیم ادبی تنقید یا قدیم مغربی تنقید معنون کر کے پروفیسر اشرفی یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ان کے حالات سے بھی واقف رہیں۔ اس لیے کہ زمانے نے انھیں بہت سے مشاہدے اور تجربے سے ہمکنار کیا ہے۔ وہ اپنے ہمعصر نقاد کو اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے تجربوں میں علم کا حصول بھی ہے۔

'مغربی ومشرقی شعریات' (۲۰۱۰ء)

صف اول کے ممتاز شاعر مظہر امام کے نام:

یوں نہ مرجھا کہ مجھے خود پہ بھروسا نہ رہے
پچھلے موسم میں ترے ساتھ کھلا ہوں میں بھی

مظہر امام مرحوم پروفیسر اشرفی کے خاص دوستوں میں تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ ہر دوسرے تیسرے دن فون پر طویل گفتگو ہوتی تھی۔ ایسے موقع پر کبھی کبھی میں بھی موجود رہا ہوں۔ 'مغربی ومشرقی شعریات' اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے زمانے میں مظہر امام سخت علیل تھے، وہاب اشرفی صاحب خود بھی ہمیشہ علالت کا شکار رہے، لیکن انھوں نے اس کتاب میں مظہر امام کا جو شعر منتخب کیا ہے وہ ان کے دل کی کیفیت ظاہر کررہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے حوصلہ پاتے تھے، لہٰذا انتساب کے شعر کی معنویت اظہر من الشّمس ہے۔

'شناخت اور ادراک معنی' (۲۰۱۰ء)

عزیز شفیق اور محسن دوست، مشہور اور ذی وقار فکشن نگار پروفیسر عبدالصمد کے نام:

ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے
آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

عبدالصمد صاحب اردو کے مایہ ناز فکشن نگار ہیں۔ پروفیسر اشرفی سے ان کی اس درجہ قربت تھی کہ اس حوالے سے پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ ان کا حق تھا کہ منتخبہ شعر کے ذریعہ ان کی توصیف کے عمل سے بھی گزریں اور اپنے احوال کو ان کے حالات پر بھی منطبق کریں۔

'میرا مطالعہ قرآن' (۲۰۱۱ء)

اپنے والدین کے نام

والدین کے نام معنون کرنا بہت درست ہے۔ ظاہر ہے ان کی تربیت اور پرداخت سے ہی مصنف موصوف کی زندگی نے معنویت پائی ہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ ان کے والدین کے دینی رجحانات کا پتا دیتا ہے۔

'کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا' (۲۰۱۱ء)

فکشن کے فنی رموز ونکات پر کلی دسترس رکھنے والی ممتاز فنکارہ جیلانی بانو کے نام:

کلک تو بارک اللہ در ملک و دیں کشادہ

صد چشمہ آب حیواں از قطرۂ سیاہی

اپنے افسانوی مجموعے کا انتساب پروفیسر اشرفی نے مشہور فکشن نگار جیلانی بانو کے نام کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ محترمہ کو فکشن کے فنی رموز ونکات پر کلی دسترس ہے۔ ساتھ ہی جو شعر درج کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں صرف جیلانی بانو کی توصیف ہی نہیں بلکہ فکشن میں ان کے کارہائے نمایاں کی تحسین دینے کی سعی کی گئی ہے۔

'مثنوی سوز وگداز' (۲۰۱۲ء)

علم دوست، پیکر محبت اور میرے دل کے قریں حسن احمد کی نذر

حافظ کے اس شعر کے ساتھ:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

حسن احمد گورنمنٹ اردو لائبریری کے لائبریرین رہے ہیں۔ وہاب اشرفی ان سے اپنی بہت سی کتابوں کا املا کرواتے رہے ہیں، اور انھیں محبت کا پیکر کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے۔

'مثنوی آب وسراب' (۲۰۱۲ء)

جدید شاعر، واقف کار، ادیب اور عزیز ڈاکٹر محسن رضا رضوی کی نذر

حافظ کے اس شعر کے ساتھ:

تا سایہ مبارکت افتاد بر سرم
دولت غلام من شد و اقبال چاکرم

'آب وسراب' جمیل مظہری کی مشہور مثنوی ہے، جس میں ان کے فلسفۂ تشکیک پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب راقم کے نام معنون ہے۔ جس شعر کا انتخاب کیا گیا ہے اس سے میرا حوصلہ بڑھا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جیسے الفاظ وآداب مجھ سے وابستہ کیے گئے ہیں، اُن کا اہل بن سکوں۔

'مثنوی زہر عشق' (۲۰۱۲ء)

Verse کا فارم اپنانے والے واحد اردو کے نقاد اور صاحب فکر شاعر

پروفیسر عبدالمنان طرزی کی نذر

حافظ کے اس شعر کے ساتھ:

سرود مجلست اکنوں فلک بہ رقص آرد
کہ شعر حافظ شیریں سخن ترانۂ توست

وہاب اشرفی کی مرتبہ مثنوی 'زہر عشق' پروفیسر عبدالمنان طرزی کی نذر ہے۔طرزی صاحب شعر ہی کے جامے میں تنقیدی کام سرانجام دے رہے ہیں اور اس باب میں مستقل منظوم کتابیں سامنے لائے ہیں۔ ایک کتاب پروفیسر اشرفی کے سلسلے میں بھی ہے۔طرزی صاحب کے اس عمل کو خراج پیش کرتے ہوئے حافظ کا جو شعر نقل کیا گیا ہے وہ حالات کی عکاسی پر مبنی ہے۔

'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' (۲۰۱۲ء)

تحقیق و تجسس کے جذبات سے لبریز نئے نقاد عزیزی ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی نذر
حافظ کے اس شعر کے ساتھ:

حسنت بہ اتفاق ملاحت جہاں گرفت
آرے بہ اتفاق جہاں می‌تواں گرفت

'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' کو اردو کی پہلی باضابطہ شعری تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔اصلی دکنی زبان میں اس کی تفہیم آسان نہیں۔آج کے حوصلہ مند نوجوان لکھنے والوں کے لیے بحوالہ ہمایوں اشرف ایک پیغام ہے جس میں ہم نئے لوگ شامل ہیں۔حوصلہ ہو اور جتن کیا جائے تو ادبی تفہیم مشکل نہیں۔

'مثنوی گلزار نسیم' (۲۰۱۲ء)

میرے قریبی دوست اور مہربان اور اپنی وضع کے نمایاں دردمند شاعر حسن نواب حسن کی نذر
اس شعر کے ساتھ:

خورشید در ہوائے تو چوں ذرہ پائے کوب
جمشید در حریم تو چوں بندگاں بہ پائے

وہاب اشرفی نے حسن نواب حسن کی توصیف کی ہے۔ان کی دردمندی سے وہ متاثر ہیں۔ شعر اغراق کی منزل کا ہے۔

'مثنوی اور مثنویات' (۲۰۱۲ء)

قدیم و جدید رنگ و آہنگ کے ممتاز شاعر اور دوست سلطان اختر کی نذر
حافظ کے اس شعر کے ساتھ:

ہر گل نو کہ شد چمن آرائے

اثر رنگ و بوئے صحبت اوست

سلطان اختر ہمعصر شاعروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ان پر کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ایک تفصیلی مضمون خود وہاب اشرفی نے لکھا ہے۔منتخبہ شعر ان کی عظمت کے اعتراف میں ہے اور خوب ہے۔

مندرجہ بالا مباحث سے انتسابات کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور یہ بھی کہ جس کے نام کتاب معنون ہے اس کے متعلق مصنف کی رائے کیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم اہم لکھنے والوں کی کتابوں کے انتسابات پر نظر ڈالی جائے اور ان کی اہمیت کو سامنے لانے کی سعی مستحسن کی جائے۔

☆☆☆

Dr. Mohsin Raza Rizvi
Asst. Professor & Head,
Dept. of Urdu, Oriental College,
Patna City- 800008, Mob.9431443778
E-Mail: mrrizvi1965@gmail.com

کالیداس کا عظیم شاہکار: میگھ دوت

عشرت ناہید

ہندوستان کے وسط میں واقع شہر اجین اپنی تاریخی عظمتوں کی بنا پر بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ شپرا ندی کے کنارے بسے ہوئے اس شہر کےساندی پنی آشرم کو یہ فخر حاصل ہے کہ شری کرشن نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی شہر پر وکر مادتیہ جیسے عاقل اور عادل بادشاہ نے مدت مدید تک حکومت کی۔ کالیداس اسی علم دوست اور ادب نواز بادشاہ کے نورتنوں میں سے ایک رتن تھا۔ سنسکرت کا لازوال شاعر اور شہرہ آفاق ڈراما نگار کالیداس کی تخلیقات کئی صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی سنسکرت ادب کا بیش بہا سرمایہ تصور کی جاتی ہیں۔ محققین اور بلند پایہ ناقدین نے جن تصانیف کو مہا کوی کالیداس کے فکر و فن کا نمونہ تسلیم کیا ان کی مجموعی تعداد صرف سات ہے جن میں تین ناٹک اور چار شعری شاہکار ہیں۔

۱۔ رتو سنگھار (نظم) ۲۔ مال ویکا گنی متر (ڈراما) ۳۔ وکرم وروشی (ڈراما) ۴۔ کمار سمبھو (نظم)
۵۔ میگھ دوت (نظم) ۶۔ رگھوونش (نظم) ۷۔ ابھگیان شکنتلم (ڈراما)

اس ترتیب کو بھی محققین نے درست قرار دیا ہے کیوں کہ ان میں فنکار کا بتدریج پختگی کی طرف بڑھتا ہوا فنی شعور ملتا ہے۔ ان گراں قدر فن پاروں میں میگھ دوت سب سے منفرد اور حسین ترین نظم ہے۔ نازک تخیلات کی مظہر اور فن شاعری کا لافانی نمونہ، سوز و فراق کا نغمہ، جس میں حیات و کائنات کی کامیاب عکاسی اور کالیداس کی اعلیٰ ترین تخلیقی قوتوں کا فن کارانہ اظہار ملتا ہے۔

'میگھ دوت' کے ویسے تو کئی زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں لیکن اردو میں اس کا منظوم ترجمہ پربھودیال مصر عاشق لکھنوی نے 'پیک ابر' کے نام سے ۱۹۱۶ء میں کیا۔ 'میگھ دوت' کا دوسرا اردو ترجمہ بھی منظوم ہوا جسے صمیم برقی نے ۱۹۱۸ء میں کیا۔ اس ترجمے کو انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ نے شائع کیا۔ ایک اور ترجمہ بابو گجپت سرن داس وکیل (دہرہ دون) نے 'سحاب قاصد' کے نام سے کیا، جسے رشید احمد صدیقی نے

اپنی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی ادبی رسالے 'سہیل' (علی گڑھ) میں ۱۹۲۶ء میں بالاقساط شائع کیا۔ اردو نثر میں ایک ترجمہ منشی اما شنکر فنا نے بھی کیا جو ماہنامہ 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا۔ 'میگھ دوت' کا ایک ترجمہ مشورہ پاکٹ بکس نے بھی اپنی ایک روپے والی سیریز میں پیش کیا تھا جو معریٰ نظم میں تھا۔ اس کے علاوہ ایک منظوم ترجمہ تنویر احمد علوی کا بھی ملتا ہے۔

'میگھ دوت' کا شمار مختصر نظموں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں کل ایک سو پندرہ شلوک ہیں اور یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں قدرتی مناظر اور برسات کی بہاروں کا ذکر ہے۔ اسی حصے سے ہندوستان کے جغرافیہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ عشق و محبت اور ہجر و وصال کے جذبات کی مصورانہ پیش کش پر مبنی ہے۔

کالیداس کی اس نظم میں ہندوستان کی سرزمین سے والہانہ لگاؤ ملتا ہے۔ اس کے صحرا، پہاڑ، ندیاں، سنگم، سرحدیں، اس کے چرند و پرند، یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، عبادتوں کے طریقے، آشرم، مندر، فنون لطیفہ سے لگاؤ غرض کہ زندگی اور اس سے متعلق تمام اشیا کا تذکرہ متاثر کن انداز میں پایا جاتا ہے۔ 'میگھ دوت' نظم میں دراصل ایک یکش اور اس کی محبوبہ جو کہ اس کی بیوی بھی ہے، سے ہجر کی داستان بیان کی گئی ہے۔

راجا کبیر جو کہ ہندو اساطیر کی رو سے دولت کا راجا ہے اور یکش جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے، وہ اپنی بیوی کی محبت میں سرشار ہو کر اپنے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی برتنے کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ جس سے کبیر سخت ناراض ہو کر اسے ایک سال کے لیے اپنی محبوبہ سے دور قید تنہائی کی سزا دیتا ہے جسے کاٹنے کے لیے یکش رام گری پہاڑی پر رہتا ہے۔ کچھ دن تک تو جدائی کے صدمے کو جھیلتا ہے مگر جب یکم اساڑھ آتا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک بادل نظر آتا ہے تو وہ بے ساختہ مضطرب ہو اٹھتا ہے اور وفور شوق سے بے تاب ہو کر اس ابر سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس سے اپنا پیامبر بننے کی درخواست کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''اے بادل تم جو مقدس پہاڑوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور اندر دیوتا نے تمھیں اپنے ترجمان کا منصب عطا کیا ہے اور میں جو کہ دیوتاؤں کا مقرب ہو کر بھی ان دنوں معتوب ہوں، تمھارے پاس ایک آرزو لے کر آیا ہوں۔ ایک امید کہ تم میرا پیغام میری محبوبہ تک پہنچا دو گے۔ ایک تم ہی ہو جو میرا یہ کام بخوبی انجام دے سکتے ہو۔''

یکش میگھ کو الکا پوری کا راستہ تفصیل سے سمجھاتا ہے، اس کے راستے میں آنے والے شہروں، پہاڑوں، دریاؤں، باغوں، پپیہوں، موروں کی خوبصورتی کو بتاتے ہوئے اپنے گھر کا نقشہ بھی بتاتا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنی محبوبہ کی حالت زار کا منظر بڑے دکھ بھرے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

’’میری محبوبہ، میری بیوی، میری جدائی میں میرے فراق میں چکوری کی مانند تنہا ہوگی، اسے رنجیدہ اور خاموش بیٹھے دیکھ کر تم اسے پہچان لینا۔ کیونکہ وہ میرا ہی دوسرا روپ ہے۔ اس کا رنگ صدمے سے زرد ہو گیا ہوگا، آنکھیں مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے سوجی ہوئی ہوں گی۔ ایام فرقت کو وہ کبھی میری تصویر بنا کر تو کبھی فرقت سے بھرے نغمے گا کر کاٹتی ہوگی۔ بے خودی کے عالم میں اسے موسیقی کے اتار چڑھاؤ کا بھی ہوش نہ ہوگا۔

اے میرے پیامبر! تم جب وہاں پہنچو تو اس کے پلنگ کے پاس والی کھڑکی پر قیام کر لینا۔ تم دیکھو گے کہ وہ تمام رات میرے فراق میں پہلو بدلتی ہوگی۔ وہ شب دیجور کو آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دیتی ہوگی۔ اور ہے بادل! میرے قاصد! یہ سب باتیں میری مبالغہ آرائی نہیں ہیں تم خود اسے دیکھ کر اس سچائی کو جان لو گے۔

ہاں مگر، اگر تم اسے محوِ خواب دیکھو تو یکلخت آواز نہ دے دینا۔ تم تھوڑا ٹھہر جانا تا کہ خواب میں وہ مجھ سے مل جائے۔ لیکن اگر ایک پہر گزر جانے پر بھی وہ نہ جاگے تو تم اسے صبح کے وقت بادِ نسیم کے جھونکوں سے آہستہ سے جگا دینا۔ وہ یہ جان کر کہ تم میرا سندیسہ لائے ہو اسی محبت بھرے انداز میں تمہیں دیکھے گی جیسے سیتا نے راون کی قید میں اشوک کے درخت پر ہنومان کو دیکھا تھا۔ پھر میرا یہ پیغام اسے دینا:

تمہارا شوہر رام گری میں تمہارے ہجر میں بالکل اسی حال میں ہے جس میں تم ہو۔ اس کا مقدر ان دنوں بگڑا ہوا ہے کہ وہ تم سے مل نہیں سکتا۔ اس لیے اپنے جذبات کا اظہار اس نے میرے ذریعے کیا ہے:

ملتی ہے تیری نزاکت مال کنگنی میں اگر
چاند میں ملتی ہے تیرے روئے روشن کی چمک
چشم آہو میں اگر ملتی ہیں تیری چتونیں
موج بحر آب میں ہے تیرے ابرو کی لچک
ملتی ہے زلف معنبر گر پر طاؤس میں
ایک جا ملتی نہیں تیرے سراپا کی جھلک

اس سے کہنا کہ وہ تیری یاد میں بے قرار ہے اور ہجر کے دن اور رات کاٹنا اس کے لیے بھی دشوار ترین ہے۔ کبھی وہ اگر تیری طرح محوِ خواب ہوتا ہے تو اس کا حال بھی کچھ اس طرح ہوتا ہے:

ہاتھ پھیلاتا ہوں سینے سے لگانے کے لیے
دیوتا روتے ہیں میری بے کسی پر دل کو تھام

گرتے ہیں برگ نہال دشت پر اشک رواں
جو چمکتے ہیں در شہوار کی صورت مدام

پھر وہ اپنے پیامبر سے کہتا ہے کہ تم اس کو حوصلہ دینا کہ اب ایکادشی کو دن ہی کتنے بچے ہیں صرف چار مہینے۔ یہ بھی پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔ آخر میں یکش میگھ کے اس کام کے منظور کر لیے جانے کا سوال بھی کرتا ہے اور خود ہی مثبت جواب بھی دے دیتا ہے اور پھر اظہار تشکر بھی ضروری سمجھتا ہے اور دعائیہ انداز میں کہتا ہے کہ تم مسلسل برستے ہوئے کبھی اپنی پیاری محبوبہ بجلی سے لمحہ بھر کے لیے بھی جدا نہ ہو پاؤ۔ نظم یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ منشی پریم چند اس نظم کے متعلق رقم طراز ہیں:

’’ میگھ دوت میں حسن وعشق، فرقت و وصال کے جذبات اس قدر موجود ہیں کہ جن پر کسی زبان کی مایہ شاعری کو ناز ہو سکتا ہے۔ اس نظم کے خیال پر اہل ذوقِ سلیم محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ پہلے دل وجگر پر ایک بامزہ اثر ہوتا ہے پھر فوراً جذبات کی لطافت، خیال کی نوعیت اور حسن بیان کو دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔ ہمارے اردو کے عشاق نے صبا کو نامہ بر بنایا۔ امیر (غالباً میر سے مراد ہے) نے اولاً یہ خدمت صبا کو سونپی اور داغ کو بھی اس سے تیز رو بے نیازِ دربان قاصد کوئی نظر نہ آیا۔ دو صدیوں تک صبا نے یہ خدمت انجام دی مگر کالیداس نے نیا قاصد ڈھونڈ نکالا۔ وہ میگھ یعنی ابر کو اپنی حدیث غم سناتا ہے۔ ایسی ایسی جدتوں سے اس کا کلام مالا مال ہے۔‘‘ (کالیداس، چودھری جے کرشن، ص ۱۲۴)

’میگھ دوت‘ میں کالیداس نے حیات وکائنات کے باہمی رشتوں کو نہایت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی اور اس کے ذرّے ذرّے سے والہانہ لگاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم حیات پر ان کی کتنی گہری نگاہ تھی۔ عشق کے جذبات، محبت وحسرت کی ترجمانی ان کا خاص فن ہے کہ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس نظم کی تابناکی مشرقی ادبیات کو پوری طرح روشن ومنور کیے ہوئے ہے۔ انھیں تمام خوبیوں نے کالیداس کو شہرہ آفاق شاعر کا درجہ دلایا ہے۔

☆☆☆

Dr. Ishrat Naheed
MANUU, Lucknow Campus,
Nadwa Road, Lucknow,
Mob. 9598987727
E-Mail: ishratnahid@gmail.com

'مدّوجزر' ایک دلکش خودنوشت

ذیشان حیدر

جب مصنف اپنے احوال وآثار خود ہی قلمبند کرتا ہے تو اسے ادبی اصطلاح میں 'خودنوشت' کہتے ہیں۔متعدد علمی شخصیات نے اپنی آپ بیتی کو زیورِقلم سے آراستہ کیا ہے اور یادگار کے طور پر دنیائے ادب کو گراں قدر ادبی سرمایہ عطا کیا ہے،ان میں شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر نے اپنے حالات وواقعات پر مشتمل ترکی زبان میں 'توزکِ بابری' تصنیف کی ہے،جس کو عبدالرحیم خانخانان نے سلیس فارسی زبان میں منتقل کیا ہے۔ شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر نے بھی 'توزکِ جہانگیری' کی شکل میں اپنے حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے۔میرتقی میر نے 'ذکرمیر' میں اپنی آپ بیتی بیان کی ہے۔اردو میں بھی کئی خودنوشت منظرعام پر آکر قبولیت کی سند حاصل کرچکی ہیں جن میں جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

ایک عمدہ خودنوشت تحریر کرنے والا ادیب اپنے احوال وآثار کو متعدد بار تحریر کرتا ہے۔اس کی علت یہ ہوتی ہے کہ وہ حالات کی تبدیلی کے باعث ماقبل کی تحریر سے مطمئن نہیں ہوتا اور اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔آخرکار ایک وقت ایسا آتا ہے کہ خواہ اسے اپنی تحریر پر پوری طرح اطمینانِ قلب حاصل ہو یا نہ ہو،اس سے راضی ہونا پڑتا ہے۔اس مفہوم کو جوش ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت 'یادوں کی برات' میں اس طرح پیش کیا ہے:

''میں نے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کے سلسلے میں کامل چھ برس تک زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا،اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا،پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا، اس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا،پھر ڈیڑھ پونے دوسال صرف کرکے نوسوصفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا اور تین ہزار میں اُس کی کتابت بھی مکمل کرالی،مگر جب اُس پر غائر نظر ڈالی

تو پتا چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے جو صبح کو بیدار ہوکر رات کے خواب کو اس خوف سے جلدی جلدی اُلٹا سیدھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے اور خدا خدا کرکے اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جارہا ہے،اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا ہے کہ دوبرس مزید عرق ریزی کرکے پانچواں مسودہ لکھوں اور اُسے بھی قلم زد کردوں۔''(1)

'مدّوجزر' میرے شفیق استاد پروفیسر ولی الحق انصاری کی تحریر کردہ ایک دلکش خودنوشت ہے جس نے اپنی روشِ تحریر کی شیرینی،نشست الفاظ اور طرزِ بیان کے باعث قبولیت خاص وعام حاصل کرلی ہے۔یہ کتاب ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی (سابق افسر بکارِ خاص،رام پور رضا لائبریری) کے تعاون سے ۲۰۰۷ء میں رام پور رضا لائبریری سے شائع ہوئی۔

'مدّوجزر' مقدمہ،اکیس ابواب،ضمیمہ اور اختتامیہ پر مشتمل ہے۔آغازِ کتاب میں وقارالحسن صدیقی نے مختصر وجامع پیش لفظ قلمبند کیا ہے جس میں پروفیسر موصوف کی سوانح حیات کو بالاختصار تحریر کیا ہے۔

اس خودنوشت کو رشتۂ تحریر میں لانے کا سبب موصوف کے چند احباب ودانشوران کا اصرار اور اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کا دیگر افراد تک منتقل کرنا ہے جس سے حدّ امکان تک کسی کی راہِ حیات کے تعین میں مدد مل سکے۔ چنانچہ خود ولی الحق انصاری تحریر کرتے ہیں:

''دوستوں کے اصرار کے علاوہ زندگی کے تجربات بھی جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں،اس بات کے محرّک ہوئے کہ زندگی میں جو کچھ اچھا بُرا پیش آیا ہے،صفحۂ قرطاس پر قلمبند کردوں۔ممکن ہے کہ وہ کسی کی راہِ حیات متعین کرنے میں مدد کرسکے۔''(2)

مصنف نے 'مدّوجزر' کو تقریباً دوسال کی مدت میں تحریری جامہ عطا کیا ہے۔اس دوران ان کی بینائی بھی کافی متاثر ہوچکی تھی۔انھوں نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ اس خودنوشت میں لکھے ہوئے تمام مطالب حقائق پر مبنی ہیں۔وہ تحریر کرتے ہیں:

''دوسال قبل جس وقت اس کتاب کو لکھنا شروع کیا تھا ایک زاویے سے اطمینان سے لکھ پڑھ سکتا تھا لیکن اس وقت جب اسے ختم کررہا ہوں اپنا لکھا ہوا خود پڑھنا بے حد دشوار معلوم ہورہا ہے۔ان حالات میں ممکن ہے کہ بہت سی باتوں کو مکرر تحریر کرگیا ہوں لیکن یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں تضاد نہیں ملے

گا، اس لیے کہ وہ سب حقائق پر مبنی ہے۔''(3)

ولی الحق انصاری کا سلسلۂ نسب معروف صحابی و میزبانِ رسولؐ جناب ابوایوب انصاری سے متصل ہوتا ہے۔ ان کا تعلق علمائے فرنگی محل کے مشہور خانوادے سے ہے۔ سہالی ضلع بارہ بنکی میں آباد انصاری خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیخ علاء الدین ہروی کا تعلق انصاریانِ ہرات کی اس جماعت سے ہے جو تیمور کے حملہ کے دوران دوبارہ ہندوستان آئے۔ اورنگ زیب نے شیخ علاء الدین ہروی کے اخلاف میں ملا قطب الدین کے بعد ان کے دو فرزندوں ملا اسعد اور ملا سعید کے نام جاری ایک فرمان کے تحت سہالی کے باقی ماندہ انصاری افراد کو لکھنو منتقل کر دیا۔ لکھنو میں واقع احاطۂ چراغ بیگ میں دو عمارتیں ان کے قیام کے لیے مختص ہوگئی تھیں، ان عمارتوں کو ایک مغربی تاجر خالی کر گیا تھا۔ اسی مناسبت سے یہ فرنگی کا محل کہلاتی تھیں۔ ملا قطب الدین کے تیسرے فرزند ملا نظام الدین نے اپنے چھوٹے بھائی ملا رضا اور بھتیجوں ملا احمد، عبدالحق اور ملا عبدالعزیز کے ساتھ اسی فرنگی کے محل میں مسند درس و تدریس آراستہ کی۔ اسی مناسبت سے آئندہ جو علمی ادارہ وجود میں آیا اسے 'فرنگی محل' کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور جو نصاب جاری ہوا اس کا نام ملا نظام الدین سہالوی کے نام سے 'درسِ نظامی' رکھا گیا۔ ولی الحق انصاری کا تعلق ملا نظام الدین کے منجھلے بھائی ملا سعید سے ہے۔ جو آٹھ پشت قبل موصوف کے جد تھے۔

'مدّ و جزر' میں مصنف نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور تجربات و مشاہدات کو متعدد ابواب کے ضمن میں تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے میرے اجداد، میرا اپنا وطن لکھنو، میرے عہد کے غیر سنجیدہ اور تفریحی مشاغل، میرے عہد کے تعلیمی اور فلاحی ادارے، میں اور میرا خاندان، تعلیمی دور، سرکاری ملازمت کا دور، یونیورسٹی کی ملازمت کا اوّلین دور، دورِ صدارت، پس از بازنشستگی، دورِ جلاوطنی: مغربی بنگال میں مستقل قیام، ہندوستان میں میرے سفر، جلوہ ہائے ایران، میرا سفرِ حج بیت اللہ، میری سخن سنجی، میرا مذہب اور سماجی سرگرمیاں، حلقۂ احباب و خوشہ چینانِ علم وغیرہ کے مفصل بیان کے لیے جداگانہ اور مستقل ابواب مختص کیے ہیں۔

خودنوشت کسی فردِ واحد کے شخصی کارناموں اور کارکردگی کو خود تحریری شکل عطا کرنے کو کہتے ہیں، یعنی خودنوشت میں مصنف مرکزی کردار ہوتا ہے اور بسا اوقات وہ صیغۂ واحد متکلم کے ساتھ اپنے حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے۔ چونکہ یہ فردِ واحد سماج اور معاشرے کا ایک جزو لاینفک ہوتا ہے لہٰذا شخصی زندگی پر اجتماعی زندگی کے اثرات کا مرتب ہونا بھی ایک فطری بات ہے۔ ولی الحق انصاری نے بھی شخصی اور ذاتی طور پر مناظرِ قدرت کے مشاہدات کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر اجتماعی زندگی کے کچھ مشکل حالات کی وجہ سے

بعض اوقات ان کی یہ خواہش مکمل نہ ہو سکی، پھر اس خواہش کی تکمیل میں تیس سال کا عرصہ صرف ہوا۔ مثلاً وہ 'مدّ و جزر' خودنوشت کے پندرھویں باب 'ہندوستان میں میرے سفر' کے ضمن میں سفرِ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدۂ قدرتِ الٰہی کے سلسلے میں ہندوستان کے شمالی و مغربی علاقے یعنی کشمیر سے ابتدا کی جائے۔ اس کے بے پایاں حسن کو دیکھتے ہوئے بجا طور سے کشمیر کو ایرانِ صغیر کہا جاتا ہے اور کہا گیا ہے کہ:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اس روئے زمین پر فردوس کو دیکھنے کی تمنا ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے دل میں جاگزیں ہوئی تھی اور اسے دیکھنے کا پہلا موقع ستمبر ۱۹۴۶ء میں اس وقت ملا تھا جب Inter Versity Swimming Competition کے سلسلے میں تقسیم ہند سے قبل لاہور گیا تھا۔ ہم لوگوں نے راولپنڈی کے راستے سری نگر جانے کی پوری تیاری کر لی تھی کہ یکایک جالندھر میں ہندو مسلم فساد کی خبر ملی۔ ہمارے دو ساتھی سیگل اور زاہد بٹ پنجابی تھے۔ وہ اپنے عزیزوں کے پاس لاہور رک گئے اور میں اور رگھوبیر سنگھ سیٹھ فوراً لکھنو واپس ہو گئے۔ اس طرح کشمیر جانے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اس کے تیس سال کے بعد اس کی تکمیل کا وقت آیا۔ ۱۹۷۶ء میں مجھے کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت 'وزیٹنگ پروفیسر' (Visiting Professor) ایک مہینے کے لیے بلایا گیا اور پہلی مرتبہ میں نے قدرت کے وہ شاہکار دیکھے جنھیں دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔''(4)

ولی الحق انصاری 'مدّ و جزر' کے اٹھارھویں باب 'میری سخن سنجی' کے ضمن میں شعر و شاعری کو اپنی زندگی کے لیے لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے یہ مصرع تحریر کرتے ہیں:

نہ ہوتا شعر اگر ہمدم تو کب کا مر چکا ہوتا

یہ جہانِ فانی مقامِ عمل اور جائے عبرت ہے، لہٰذا انسان کو تجربات و مشاہدات سے نصیحت حاصل کرنا چاہیے۔ مصنف نے اس کے اختتامیہ میں قارئین کو نصیحت کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:

''میں عمر کے بیاسی سال مکمل کر رہا ہوں۔ میرے سب ساتھی جا چکے ہیں اور پتا نہیں میں خود کس وقت رختِ سفر باندھ لوں۔ اس لمبے عرصے میں اس دنیا میں جو کچھ دیکھا،

یا محسوس کیا اسے اس لیے صفحۂ قرطاس پر لے آیا کہ پڑھنے والے کچھ نصیحت حاصل کریں:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو' (5)

ولی الحق انصاری شاعرِ ذولسانین یعنی اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں 'غزالانِ خیال'، 'شاہدانِ معانی'، 'نقوشِ زیبا'، 'کہکشاں'، 'گلزار'، 'انفاسِ گرم'، 'شعلۂ ادراک'، 'خرمنِ گل'، 'شب چراغ' اور 'گل افشانیٔ خیال' قابلِ ذکر ہیں۔

مدّ و جزر کے مطالعے سے موصوف کے احوال و آثار سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے بلکہ لکھنو اور اس کے اطراف کے علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس گرانقدر اور دلکش خودنوشت اور دیگر تصنیفی کارناموں کے باعث ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

1- یادوں کی برات، جوش ملیح آبادی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، صفحہ ۹-۱۰
2- مدّ و جزر، پروفیسر ولی الحق انصاری، رام پور رضا لائبریری، صفحہ چ
3- ایضاً، صفحہ چ و ح
4- ایضاً، صفحہ ۲۸۱
5- ایضاً، صفحہ ۵۱۳

☆☆☆

Dr. Zishan Haider
MANUU, Lucknow Campus,
504/122 Tagore Marg,
Lucknow-226020, Mob. 9336027795
E-mail: zishaanhaider@yahoo.com

فراقؔ کی شاعری میں رات کا طلسم

عبدالحلیم انصاری (محمد حلیم)

فراقؔ گورکھپوری اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے غزل کی کلاسیکی روایات کو توڑے بغیر اس میں فکر کی ندرت اور زبان و بیان کی جدّت سے اپنی شعری انفرادیت قائم کی۔ وہ ایسے دور میں اپنی شاعری کو روایتی اور کلاسیکی نہج پر لے کر چل رہے تھے جب اردو شاعری میں ترقی پسندی کا دور تھا اور زبان اور فکر کی سطح پر توڑ پھوڑ کا عمل عروج پر تھا۔ غزل کو ترقی پسندی کے دور میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس میں سماجی پیغامات، سیاسی نظریات اور انقلابی گھن گرج کو سمونے کی گنجائش نہیں تھی۔ شاعری کے نام پر جو نعرہ بازی اور سطحی جذباتیت کا شور ترقی پسند تحریک کے بینر تلے ہو رہا تھا، اس کو اپنانے اور پھیلانے کی غزل جیسی لطیف اور نازک صنف متحمل نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا اس زمانے میں بھی جب ترقی پسندوں نے غزل کو قابلِ گردن زدنی قرار دیا مجروحؔ سلطانپوری اور اختر سعیدؔ خان جیسے ترقی پسند شاعروں نے غزل سے محبت کی اور اس کے گیسو سنوارے۔

اسی دور میں فراقؔ نے بھی ترقی پسندوں کی رَو میں بہنے کے بجائے نہ صرف غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا بلکہ اس کی کلاسیکی اور تہذیبی روایات کو آگے ان معنوں میں بڑھایا کہ غزل میں نئے زمانے کی تہذیبی قدروں کے ساتھ ساتھ نئے انسان کے جذبات اور محبت کے نئے منظر نامے کو غزل میں سمویا اور زبان میں توازن اور اعتدال کے ساتھ جدّت طرازی بھی کی۔ انھوں نے ترقی پسندی کا زمانہ بھی دیکھا تھا اور جدیدیت کا عروج و زوال بھی، لہٰذا ان کی غزلیہ شاعری میں تمام شعری روّیوں کے مثبت عناصر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے روایت اور جدّت کے امتزاج سے ایک نیا پیرایۂ اظہار وضع کیا جو ان کی شناخت بن گیا۔

فراقؔ انگریزی ادب کے استاد تھے اور انھوں نے انگریزی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے خصوصاً انگریزی کے فطرت نگار شعرا کیٹس، شیلے اور ولیم ورڈس ورتھ کی شاعری کا اثر قبول کیا

تھا۔ جدیدیت میں جب غزلوں میں ہندوستانی تہذیبی عناصر، اقدار اور فطرت کے اجزا کو استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہوا تو اس کی جھلک فراقؔ کی شاعری میں بھی دکھائی دی۔ فطرت فراقؔ کی شاعری میں ایک خوابناک اور طلسمی فضا قائم کرتی ہے۔ فراقؔ کا لہجہ چوں کہ نرم اور لطیف ہے اس لیے ان کی غزلوں میں فطرت کے مختلف مظاہر و مناظر اور کیفیات کا بیان ان کی شعری زبان سے ہم آہنگ ہو کر ایک انوکھی تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔

ان کی غزلوں میں شام، رات، تنہائی، چراغ، شمع، وغیرہ ایک خاص وقت کا تاثر دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں رات مختلف روپ، مختلف کیفیت اور مختلف پیکروں میں موجود ہے۔ رات ان کے ذہن میں ایک پُراسرار پیکر ہے جو انھیں اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے اور وہ زندگی کے مختلف رنگوں اور کیفیتوں میں رات کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ فراقؔ کی پوری غزلیہ شاعری کا مطالعہ کریں تو ان کی شاعری میں رات کی جلوہ سامانیوں کے مختلف انداز دکھائی دیں گے:

اس دور میں زندگی بشر کی　　　بیمار کی رات ہوگئی ہے

انھوں نے ترقی پسندوں کی طرح انسانی زندگی کی محرومیوں، اذیتوں اور بے بسی کو اشتراکی نعروں اور گھن گرج والے الفاظ میں نہیں بلکہ غزل کی لطافت، نزاکت اور شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے 'بیمار کی رات' سے تشبیہ دی اور ایک مختصر سے شعر میں ایک عہد کے انسان کی تمام کہانی بیان کر دی۔ انھوں نے 'بیمار کی رات' کی اصطلاح کے استعمال سے شعر میں ندرت پیدا کر دی اور ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے ایک گہری اور معنویت سے پُر بات کہہ دی:

اکا دُکا صدائے زنجیر　　　زنداں میں رات ہوگئی ہے

اس شعر میں انھوں نے 'زنداں میں رات' کا منظر پیش کر کے شعر کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔ وہ رات سے مختلف طرح کے اچھوتے پیکر تراشنے کے عمل میں ماہر ہیں۔ زنداں میں رات کے ساتھ اکا دُکا صدائے زنجیر کا تصور بغاوت کی اکا دُکا آوازوں کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ یعنی رات جو غلامی کی علامت ہے اس میں سبھی لوگ سہمے اور ڈرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ کچھ سرکش لوگ جاگ رہے ہیں۔ رات کی خاموشی موت کی علامت بھی ہے اور اس خاموشی میں زنجیروں کی صدائیں ابھی جاگ رہی ہیں، اس لیے صورت حال مایوس کُن نہیں ہے۔ انقلاب کی چنگاری قیدیوں میں باقی ہے، بلکہ زنجیر کی صدا قیدیوں کی خفیہ سرگرمیوں کی غماز بھی ہے:

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل　　　وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

یہاں رات محکومی اور غلامی کی علامت ہے اور صبح کو انقلاب آنے والا ہے۔ اسی امید میں کوئی سویا

ہوا نہیں ہے۔ ذرّے ذرّے میں نئی صبح کی امید جاگ رہی ہے۔ یہاں بھی انھوں نے زمین، رات اور انقلاب کی تمثیل کے سہارے ہندوستان کی آزادی کے لمحے کی تصویر غزل کی زبان میں بیان کر دیا ہے:

رات چلی ہے جوگن بن کر بال سنوارے لٹ جھٹکائے
چُھپے فراقؔ گگن پر تارے، دیپ بجھے ہم سو جائیں

یہاں رات جوگن بن کر بال سنوارے اور لٹ جھٹکائے جا رہی ہے، گگن کے تارے چُھپ گئے ہیں، دیپ بھی جل جل کر بجھ چکے ہیں، اس لیے شاعر کو بھی ہنگامِ سحر نیند آنے لگی ہے۔ رات یہاں زندگی کا استعارہ ہے اور پھر رات ایک جوگن بھی ہے، یعنی اس شعر میں استعارہ در استعارہ ہے۔ جوگن ساری رات شاعر کے ساتھ رہی مگر چوں کہ جوگن کسی کی نہیں ہوتی اس لیے وہ رات شاعر کے ساتھ بسر کرنے کے بعد سحر کے وقت اُٹھ کر شاعر کے پہلو سے بال سنوار کر اور ادائے بے نیازی سے لٹ جھٹکائے چل پڑتی ہے۔ آسمان پر تارے اور شاعر کے شبستاں کے دیپ بجھ چکے ہیں یعنی زندگی کی آرزوئیں اور امنگیں ختم ہو چکی ہیں اور شاعر بھی موت کے پہلو میں سما جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کی حقیقت اور اس کی بے وفائی اور بے ثباتی کو 'جوگن' کے استعارے کی مدد سے فراقؔ نے جس خوبصورتی اور مہارت سے پیش کیا ہے وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں　　　ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فراقؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں ارضیت پیدا کی اور اس کا رشتہ ہندوستان کے مزاج اور اس کے عوام کی نفسیات سے جوڑا۔ اندھیری اور سنسان رات میں جب کوئی بچہ تنہا سو رہا ہوتا ہے اور اسے خوف اور گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے تو وہ معصومیت سے چادر تان کر اس میں منہ چھپا لیتا ہے اور چادر کے اندر وہ خود کو خوف اور خطروں سے محفوظ سمجھتا ہے۔ فراقؔ کے اندر کا معصوم سا بچہ بھی جب غموں اور پریشانیوں اور خوف و ہراس سے گھرا ہوا محسوس کرتا ہے تو محبوب کی یاد کی چادر میں اپنا سراپا چھپا لیتا ہے جہاں وہ غمِ روزگار سے بھی چند لمحوں کے لیے پوری طرح پناہ حاصل کر لیتا ہے۔ ترقی پسندوں نے آزادی کے بعد کی مایوس صورتحال سے گھبرا کر کہا تھا:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر　　　وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فراقؔ نے ترقی پسندانہ زبان استعمال کرنے کے بجائے غزل کے کلاسیکی لہجے میں اسی مفہوم کو ایک آفاقی پس منظر میں اس شعر میں پیش کر دیا:

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے　　　اے دورِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

'دورِ آسماں' سے مراد 'انگریزوں کی حکومت' اور 'دورِ حیات' سے مراد آزادی کا دور۔ لہٰذا امید تو یہ تھی

کہ انگریزوں کی حکومت کے جانے کے بعد آزادی یعنی دورِ حیات آئے گا، مگر ایسا نہیں ہوا اور شاعر اب بھی آزادی کی صحیح معنوں میں آمد کا منتظر ہے۔ ہجر کی سیاہ رات کٹی نہیں ہے اور عروسِ حیات کا وصل اب بھی ایک خواب ہے۔ فراقؔ کی شاعری کا یہی اعجاز ہے کہ وہ سیاسی و سماجی موضوعات کو بھی خالص غزل کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی طرح کھلے الفاظ میں نہیں کہتے:

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحر و شام فراقؔ　　ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

شاعر اپنے وجود کو رات کے کٹ جانے کا پیکر کہتا ہے یعنی میرا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ رات گزر چکی ہے اور دن نکل چکا ہے۔ مگر دن کی یہ سفیدی زندگی کی روشنی نہیں ہے بلکہ کفن کی سفیدی ہے۔ آزادی کے بعد کی شام و سحر میں زندگی کی رمق نہیں بلکہ موت کی سرد مہری اور بے حسی ہے۔ اس شعر کو کسی بھی معاشی اور سیاسی صورت حال پر منطبق کیا جا سکتا ہے جہاں نئی صبح اور نئے نظام کے بلند بانگ دعووں کے بعد صورت حال مایوس کُن نکلے۔ فراقؔ کے مندرجہ ذیل اشعار میں ناصرؔ کاظمی کے لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

غزل کے ساز اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات　　نوائے میرؔ سناؤ بڑی اداس ہے رات

......

نغمۂ جلوۂ رُخ گاؤ کہ کچھ رات کٹے　　شعلۂ عشق کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے

فراقؔ رات کو محبوب کا پیکر بھی سمجھتے ہیں۔ جب رات چارسو پھیل جاتی ہے تو انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا محبوب اپنی زلفیں کھول رہا ہے۔ ایسے میں ان کی غزل محبوب کے حسن کو اور بھی نکھار دیتی ہے:

تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے　　میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

یہاں تاریکیوں کا چمک جانا اور آواز کا درد اچھوتے پیکر ہیں۔ رات کی زلفوں کا سنور جانا بھی خوبصورت بصری اور حسی پیکر ہے۔ اسی مفہوم کو انھوں نے ان اشعار میں بھی پیش کیا ہے:

جب ساز غزل کو چھوتا ہوں راتیں لو دینے لگتی ہیں
ظلمات کے سینے میں ہمدم میں روز چراغاں کرتا ہوں

موت اک گیت رات گاتی تھی　　زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

زندگی اک رقاصہ ہے جو موت کے دُھن پر ناچتی ہے۔ زندگی کو اگر موت کا خوف نہ ہو تو اس کی رونق اور رنگینی ختم ہو جائے گی۔ غالبؔ نے اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

رات دنیا کے لیے نیند کا موقع ہے جو بے فکری اور بے خبری کے لمحے اور موت کی بے حسی اور سناٹا

لے کر آتی ہے، مگر شاعر کے لیے رات کی خاموشی اور تنہائی اس کی حسیت کے بیدار ہونے، فکر کو مہمیز کرنے، زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور کرنے، خود احتسابی کے عمل سے گزرنے، روح کے زخموں کو شمار کرنے اور محبوبِ حقیقی کے حُسن کے جلووں سے اپنی ہستی کے گوشوں کو روشن کرنے کے لیے قیمتی لمحوں کا نام ہے۔ شاعر رات کے پُرسکون لمحوں میں ہی اپنی ذات سے گفتگو کر سکتا ہے اور کائنات کے بطن میں اُتر کر علم و دانش کے موتی چُنتا ہے۔ لہٰذا، رات شاعر کے لیے ایک دن سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ دن جہاں شاعر کے لیے مادّی آسائشوں کی خواہش پیدا کرتا ہے، ہوس کو ابھارتا ہے اور انسان کی ذات میں منفی قوتوں کو پیدا کرتا ہے، وہیں رات انسان کی چھپی ہوئی روحانی قوتوں کو بیدار کرتی ہے اور اس کے لیے ارفع و اعلیٰ مقام تک پہنچنے کا زینہ بنتی ہے۔

ہر ذرّے پر اب کیفیت نیم شبی ہے　　اے ساقیِ دوراں یہ گناہوں کی گھڑی ہے

یہاں ’کیفیت نیم شبی‘ سے مُراد جوانی کے دور کی سرمستی ہے۔ اس دور میں انسان کے بہکنے اور گناہوں میں ملوث ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ساقیِ دوراں (خدا) سے کہتے ہیں کہ جوانی کا زمانہ تو انسان کے شباب کی سرمستیوں میں ڈوب جانے کا ہی ہے۔ اس میں انسان کا کیا قصور۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گناہوں کی لذّت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ تو چاہتا ہے گناہوں سے بچنا اور دور رہنا مگر یہ کیفیت نیم شبی اس پر ایک مدہوشی اور سرور کا نشہ طاری کر دیتی ہے اور اس سرور و سرمستی کی کیفیت میں وہ گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ رات کے موضوع پر ان کے کچھ اشعار روایتی مضامین، ہجر و وصال پر ہیں جن میں رات اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوئی ہے، مگر ایسے اشعار میں بھی فراقؔ کا منفرد لب و لہجہ اور پیرایۂ اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

شب فراق اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد　　کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

فراقؔ کی غزلوں سے منتخب مندرجہ بالا اشعار سے ہمیں ان کی شاعری میں رات کی مختلف کیفیات، اس سے خلق کیے گئے مختلف پیکروں اور علامتوں کے مطالعے سے ان کی شاعری کے ایک خاص پہلو سے آشنائی ہوتی ہے۔ رات ان کے شعور میں ایک پیکر اور ایک علامت کے طور پر بار بار ابھرتی ہے اور ان کی شاعری کو ایک پُراسرار اور طلسمی فضا عطا کرتی ہے۔

☆☆☆

Abdul Haleem
Dept. of Urdu, Rani Ganj Girls College,
Rani Ganj- 713358, Mob.9093949554
E-Mail: abdul.halim.asn@gmail.com

لارڈ اینٹونی میک ڈونل اور اُردو مخالف تحریک

ناہید فاطمہ

اینٹونی میک ڈونل (۷؍مارچ ۱۸۴۴ء تا ۹؍جون ۱۹۲۵ء) کو انیسویں صدی کے ایک بڑے اور سب سے طاقتور اردو دشمن کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی نو وارد زبان جسے فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا نام دیا گیا تھا، کا مداح اور حمایتی تھا۔ اب ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب اس کالج میں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی اس نئی زبان کی اختراع کا کام ہو رہا تھا تو اس کے پس پشت انگریزوں کی منشا کیا تھی۔ میک ڈونل نے ان علاقوں سے جہاں اس کا تقرر کیا گیا تھا، اردو کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور اس کی ہندوستان گیر مقبولیت کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بند طریقے سے کام کیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک اردو زندہ رہے گی، ہندی کی مقبولیت ممکن نہیں ہو سکے گی اور ہندوستانی ہندوؤں کو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ انگریز ان کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں انھیں اپنے آپ کو ہندی کے سرپرست اور اردو کے دشمن کی حیثیت سے پیش کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی میں جاری وساری اردو مخالف تحریکوں نے اس وقت نیا موڑ لے لیا تھا جب ۱۸۹۵ء میں میک ڈونل کا تقرر صوبہ شمال مغربی واودھ کے لیفٹی ننٹ گورنر کی حیثیت سے کیا گیا۔ اس خطے میں کچھ لوگ پہلے ہی سے اردو مخالف تحریک چلا رہے تھے۔ ان لوگوں نے اس کی آمد کا جشن منایا کیونکہ یہ خبر ان تک پہنچ چکی تھی کہ میک ڈونل نے بہار میں اردو زبان کو نہایت کامیابی کے ساتھ عدالتی اور دفتری زبان کی حیثیت سے بے دخل کر کے ہندی کو رائج کر دیا تھا اور یہاں کے لوگ بجا طور پر اس سے اس بات کی امید کر رہے تھے کہ وہ ان کی نہ صرف حمایت کریں گے بلکہ ان کی اردو مخالف تحریک کو رفتار بھی دیں گے۔ بقول مرزا خلیل احمد بیگ:

''سر اینٹونی میک ڈونل کا اردو کے بارے میں رویہ انتہائی مخالفانہ تھا۔ وہ صحیح معنی میں ہندی زبان اور ناگری رسم خط کے حمایتی تھے۔ شمال مغربی صوبہ جات اور اودھ

کا لیفٹی ننٹ گورنر مقرر ہونے سے قبل وہ بہار اور بنگال میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ انھوں نے بہار کے سرکاری دفتروں میں ہندی کو رائج کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہندی کی تحریک چلانے والے ہندو میک ڈونل کے گورنر بننے سے بہت خوش تھے۔ کیونکہ ان سے ان لوگوں کی بے حد توقعات وابستہ تھیں۔'' (ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی، مرزا خلیل احمد بیگ، صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

اینٹونی میک ڈونل کی پیدائش پام فیلڈ ہاؤس، کاراکاسل شراگ، آئرلینڈ میں ۷؍مارچ ۱۸۴۴ء کو ہوئی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے کوینس کالج، گالوے میں داخلہ لیا، جسے اِن دنوں نیشنل یونیورسٹی آف آئرلینڈ، گالوے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جدید زبانوں کے ادب پر ایم۔ اے کرنے کے بعد ۱۸۶۴ء میں اس نے انڈین سول سروسز کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور اس کا تقرر ہندوستان میں صوبہ بنگال میں کر دیا گیا۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس عہد میں بنگال کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ نومبر ۱۸۶۵ء میں وہ کلکتہ پہنچا اور بہار اور بنگال کے مختلف علاقوں میں اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔

بہار میں جی کیمبل پہلے ہی سے اردو کی بنیادیں کمزور کرنے کی بھرپور کوششیں کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر فیلن، جسے اردو زبان میں کماحقہٗ مہارت حاصل تھی، لیکن وہ اس زبان کے مخالفین میں شامل تھا، یہاں مہتمم مدارس کی حیثیت سے سرگرم کار تھا۔ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ جی کیمبل کی معاونت کر رہا تھا۔ اینٹونی میک ڈونل جب یہاں کلکٹر کی حیثیت سے پہنچا تو ان لوگوں کو اپنے کام کو آگے بڑھانے کی پوری آزادی ملی۔ قسمت نے ان تینوں اردو مخالفین کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا تھا۔ چنانچہ انھیں بنگال اور بہار میں اردو مخالف ماحول بنانے اور سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے اردو کا اخراج کرنے میں کامیابی ملی۔ بنگال اور بہار میں کامیابی کے بعد ہندی کے حامیوں کا اگلا نشانہ شمال مغربی صوبہ جات تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان علاقوں میں بھی اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری اور عدالتی زبان بنا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام کے بعد ہندی والوں کے اس منصوبوں کو اور بھی تقویت پہنچی۔ اس دوران ناگری پرچارنی سبھا کی سربراہی میں چلائی جانے والی تحریک سب سے زیادہ فعال اور متحرک تھی۔ اس تحریک کے سربراہ پنڈت مدن موہن مالویہ تھے جو اس کے رکن بھی تھے۔ ہندی کو رائج کرنے کے لیے ہندی والے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی ایک انگریزی کتاب 'شمال مغربی صوبہ جات کا عدالتی رسم خط اور پرائمری تعلیم' شائع ہوئی۔ یہ کتاب دیوناگری کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں لکھی گئی تھی اور اس کتاب نے ۱۸؍اپریل ۱۹۰۰ء کے سرکاری فیصلے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ پنڈت

مدن موہن مالویہ اور دیگر ہندی والوں نے اردو کو اسکولوں اور دفتروں سے نکال کر دیوناگری ہندی کو اس کی جگہ دینے کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یعنی ۱۸۹۵ء میں اردو کا دشمن اینٹونی میک ڈونل صوبہ شمال مغربی و اودھ کا لیفٹی نٹ گورنر بن کر آ گیا اور اس تحریک کو چلانے والوں کو جیسے من کی مراد مل گئی۔ اس سے ہندی والوں کے منصوبے کو اور بھی تقویت پہنچی۔ ان لوگوں نے میک ڈونل کے ساتھ مل کر اردو کے خلاف ایک مہم چھیڑ دی۔ بقول حکم چند نیرؔ:

''شمال مغربی صوبہ جات کے نئے گورنر اینٹونی میک ڈونل ہندی زبان اور دیوناگری خط کے زبردست حامی تھے۔ موصوف نے بہار میں ہندی سے متعلق حکام بالا کے فیصلوں کو متاثر کرنے اور دفتروں میں اسے رائج کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ناگری اور کیتھی کے خلاف عرض داشتوں کا سختی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ مغربی صوبہ جات کے حاکم اعلیٰ کے عہدوں پر ان کی تقرری ہندی اور دیوناگری کے لیے یقیناً ایک بشارت تھی۔ ہندی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندی کے تمام اخباروں اور انجمنوں نے انھیں خوش آمدید کہا اور بہار میں ہندی کی ترویج کے سلسلے میں ان کی خدمات کی تعریفیں کیں''۔ (اردو کے مسائل، حکم چند نیر، صفحہ ۱۲۷)

میک ڈونل کے بارے میں آلوک رائے لکھتے ہیں:

"Well before 1900, Mac Donnell was already something of a folk hero in Nagri Hindi circles, After all he came to NWP&O with his Bihari reputation. As officiating secretary to the Lt. Governer of Bengal, Mac Donnell had been actively involved with the introduction of the Nagri Character in the courts and administration of Bihar".(Hindi Nationalism, Alok Rai, Page 18)

اس سے پہلے بھی ہندی کے حامی ہندی کو رائج کرنے کے لیے بارہا کوششیں کر چکے تھے۔ ۲/مارچ ۱۸۹۸ء میں ایک بار پھر ہندی والوں نے میک ڈونل کے پاس ہندی کو تعلیمی اور سرکاری زبان بنانے کی غرض سے ساٹھ ہزار دستخطوں پر مشتمل ایک عرض داشت پیش کی۔ اس عرض داشت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم عدالتی کارروائیوں کی زبان کے سلسلے میں کوئی حکم جاری کرنے کے لیے نہیں کہتے، کیونکہ موجودہ احکام کے پیشِ نظر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ریورنڈ میڈن مرحوم کے الفاظ میں ہم صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ عدالتوں سے جاری ہونے والے سمنوں، فیصلوں اور ڈگریوں میں ملک کی عظیم اکثریت کا رسم خط بھی استعمال کیا جائے۔

حسبِ ضرورت ان کے لیے فارسی، اردو یا انگریزی کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ سرکاری کارروائیوں کے لیے مروجہ اصطلاحوں کے علاوہ نئی اصطلاحوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ عدالتوں میں بالعموم عوام کا رسم خط استعمال کیا جائے نہ کہ غیر ملکی رسم خط اور یہ کہ یہ زبان کسی مخصوص طبقے کی نہیں ہونی چاہیے۔ ہندوؤں یا مسلمانوں سے تعلق کی وجہ سے کسی اصطلاح کو مسترد نہ کیا جائے بلکہ صرف وہی اصطلاحیں استعمال کی جائیں جو عوام کی اکثریت کے لیے بہ آسانی قابلِ فہم ہوں اور انھیں ایسے رسم خط میں لکھا جائے جسے اکثریت سمجھتی ہے۔'' (اردو کے مسائل، حکم چند نیر، صفحہ ۱۳۲)

اس کا جواب دیتے ہوئے میک ڈونل نے لکھا تھا:

''عرض داشت میں رسم خط کی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا ہے نہ کہ زبان کی تبدیلی کا۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں کے دستاویزوں کی زبان اگرچہ فارسی عربی کے مشکل الفاظ سے پُر ہوتی ہے لیکن بہرحال یہ زبان ہندی ہوتی ہے جسے شمال مغربی صوبہ جات کی اکثریت بولتی ہے۔ عرض داشت دہندگان فارسی رسم خط کے بجائے دیوناگری استعمال کرنا چاہتے ہیں...... ڈاکٹر گریرسن کے مطابق صوبے کی چار کروڑ ستر لاکھ آبادی میں سے چار کروڑ چالیس لاکھ افراد ہندی یا ہندی کی کوئی علاقائی بولی یا وہ زبان بولتے ہیں جسے عرفِ عام میں ہندی کہا جاتا ہے۔ اگر ہندی کے تمام اہلِ زبان تعلیم حاصل کر لیں تو سرکاری کاروبار میں دیوناگری کی ترویج ضروری ہو جائے گی لیکن اس آبادی میں صرف تیس لاکھ افراد تعلیم یافتہ ہیں اور ان میں سے خاصی تعداد مسلمانوں کی ہے جو اردو بولتے ہیں اور فارسی رسم خط استعمال کرتے ہیں۔ پرائمری تعلیم میں توسیع اور ہندی یا ناگری یا کیتھی جاننے والوں کی تعداد میں اضافے کا مطلب یہ ہوگا کہ مستقبل قریب میں رسم خط کا سوال اہم ہو جائے گا۔'' (اردو کے مسائل، حکم چند نیر، صفحہ ۱۳۲)

سرسید احمد خاں نے ہندی والوں کے اس رویے کے بارے میں لکھا ہے:

''غالباً اس وقت ان کے (ہندوؤں کے) اس جوش سے اٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے ہز آنر لیفٹی نٹ گورنر بہادر اس زمانے میں جب کہ صوبہ بہار میں کیتھی حروف اور بہاری زبان، بہ عوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی کلکٹر و مجسٹریٹ، معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف

جاری ہوئے ہیں تامل نہ فرمائیں گے اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے مردہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا کہ ان دونوں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے۔'' (بہ حوالہ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، صفحہ ۱۶۶)

اینٹونی میک ڈونل اردو کا دشمن تھا۔ اس کی دشمنی کا واحد سبب یہ تھا کہ انگریزی حکومت اس زبان کی تحقیر کر کے مسلمانوں پر اپنے اختیار و تسلط کو مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ اسی وفاداری کے تحت اس نے بہار اور بنگال میں کامیابی حاصل کی تھی اور جتنی آسانی سے اردو کو اس کی بلندی سے اتار کر پستی میں ڈھکیل دیا تھا، یہاں صوبہ متحدہ میں یہ کام اتنا آسان ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ بہار کے مقابلے میں شمال مغربی صوبہ جات میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یہاں کھل کر اردو کی مخالفت کرنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے ہندی کی حمایت میں تحریک چلانے والوں کو مصلحت سے کام لیتے ہوئے فی الوقت صبر و سکون کے ساتھ خاموش رہنے کی تلقین کی۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آلوک رائے لکھتے ہیں:

"On 22 August 1897, while he was still Lt. Governor of NWP&O, Mac Donnell wrote to Lord Elgin that the strong opposition of muslims was a risk to security and decreed that the ratio of Muslims to Hindus should be reduced to three to five. On 18th May 1900, while his fateful order was awaiting ratification by the Governor General, Mac Donnell wrote to Curzon : We are far more interested in (encouraging) a Hindu predominance than in (encouraging) a Mohammedan predominance, which in the nature of things, must be hostile to us".(Hindi Nationalism, Alok Rai, Page 19)

دوسری جانب مسلمانوں کے اندر بھی رفتہ رفتہ سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا اور ان کو اب یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اس ساری مہم کے پس پشت انگریزوں کی منشا کیا ہے۔ انھیں یقین ہونے لگا تھا کہ اگر اردو ختم ہوگئی تو پھر مسلمان ایک منفرد قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ لہٰذا انھوں نے بھی حکومت کو متعدد درخواستیں بھجوائیں۔ مختلف علاقوں میں موجود ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لاتے ہوئے اخبارات اور رسائل میں متعدد مقالے شائع کیے، جگہ جگہ جلسوں کا انعقاد کیا گیا لیکن ان ساری باتوں سے حکومت اور میک ڈونل کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے اس فطری احتجاج کو انھوں نے مذہبی تعصب، حکومت کے کاموں میں رخنہ اور شر پسندی کا نام دیا۔

دیوناگری ہندی کو رائج کرنے کے لیے موجودہ حقائق کو مسخ کرتے ہوئے اپنے مراسلوں میں غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ ڈاکٹر گریرسن جو کہ ناگری پرچارنی کا باقاعدہ رکن بھی تھا، اس زمانے میں شمال

مغربی صوبہ جات کے لسانی جائزے پر تحقیق کا کام کر رہا تھا۔ اس نے ہندی بولنے والوں کے اعداد و شمار میں دھاندلی اور غلط بیانی سے کام لیا۔ ڈاکٹر حکم چند نیر لکھتے ہیں:

''اس نے گریرسن کے فراہم کردہ ہندی بولنے والوں کے اعداد و شمار کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ نیز یہ بھی فرض کر لیا کہ اگر یہ تمام لوگ ہندی پڑھنے لگیں تو سرکاری دفتروں کے لیے ہندی اور دیوناگری کا سوال اہم اور استعمال ناگزیر ہو جائے گا۔ اس کے نزدیک اردو اور ہندی میں رسم خط کے سوا کوئی فرق نہ تھا۔ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے پُر زبان بھی ہندی کہلا سکتی تھی۔ شمال مغربی صوبہ جات کے چار کروڑ چالیس لاکھ افراد کی مادری زبان ہندی تھی۔ کھڑی بولی پر مبنی ہندی، اودھی، پوربی، بھوجپوری، برج، بندیلی، قنوجی اور عرف عام کی ہندی یعنی اردو میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ہندوؤں کی کثرت میں وحدت کی خوش آئند اور دل کش تصویر پیش کرنے کے بعد اس نے تیس لاکھ تعلیم یافتہ افراد میں اردو بولنے اور لکھنے والے مسلمانوں کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھا لیکن اردو بولنے اور لکھنے والے ہندوؤں کا ذکر بھی نہیں کیا۔'' (اردو کے مسائل، حکم چند نیر، صفحہ ۱۳۴)

پنڈت مدن موہن مالویہ نے ناگری پرچارنی سبھا کے ساتھ مل کر ہندی کی ترویج و ترقی کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ لہٰذا، ۱۸۹۹ء تک لیفٹیننٹ گورنر کو ہندی کے حمایتی ہزاروں عرض داشتیں پیش کر چکے تھے۔ گزشتہ چار برسوں سے وہ ہندی کو رائج کرنے کی مسلسل کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان چار سالوں میں میک ڈونل نے اس جانب کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس نے اس دوران مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور جب اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ دیوناگری ہندی کی مخالفت کرنے والوں کو وہ بہ آسانی زیر کر سکتا ہے تو ۱۸/ اپریل ۱۹۰۰ء کو اس نے ہندی والوں کے مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے دیوناگری کو عدالتی اور سرکاری رسم خط بنانے کا فیصلہ کر دیا۔ بقول مرزا خلیل احمد بیگ:

''۱۸/ اپریل ۱۹۰۰ء کو بحیثیت حاکم اعلیٰ (لیفٹیننٹ گورنر شمال مغربیہ صوبہ جات و اودھ) میک ڈونل نے ایک ایسا حکم نامہ جاری کیا جس کی رو سے عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں ہندی اور دیوناگری رسم خط کو اردو کے برابر درجہ حاصل ہوگیا۔ یہ ہندی تحریک کے علم برداروں، بالخصوص ناگری پرچارنی سبھا کے کارکنوں کی بہت بڑی فتح تھی۔ میک ڈونل کے اس فیصلے سے اردو حلقوں بالخصوص مسلمانوں میں شدید بے چینی

پیدا ہوگئی۔ جگہ جگہ اس کے خلاف احتجاجی جلسے کیے جانے لگے۔ مسلمانوں کی مختلف تنظیموں اور سربرآوردہ شخصیتوں نے اس پر اپنا سخت ردعمل ظاہر کیا۔'' (ایک بھاشا جو مسترد کردی گئی، مرزا خلیل احمد بیگ، صفحہ ۱۱۶)

حکومت کے اس فیصلے کے خلاف مسلمانوں کا غم وغصہ پھوٹنے لگا۔ اس فیصلے کے خلاف تجویزیں پاس کرکے لیفٹی ننٹ گورنر کے نام بھیجی گئیں۔ لیکن ان تمام باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی دوران 'اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن' الٰہ آباد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جانب سے بھی تار اور درخواستیں بھیجی گئیں، جس کا جواب میک ڈونل نے کچھ اس طرح دیا:

''حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان اس صوبے کے پسماندہ ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل نوے فی صد آبادی کے ساتھ حکومت کے منصفانہ سلوک کے اقدام کی کھلم کھلا مخالفت کررہے ہیں۔ فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی لیکن مسلم شرفا کے وفد کے ساتھ اس حکم کے نفاذ کی تاریخ متعین کرنے کے لیے گفتگو کرسکتا ہوں۔'' (اردو کے مسائل، حکم چند نیر، صفحہ ۱۳۸)

سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد ان کے رفقا اور دیگر مسلمانوں نے اردو کے دفاع کی کوششوں کو بحال رکھا۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسوں کا انعقاد کیا گیا۔ نواب محسن الملک نے ۲ رمئی ۱۹۰۰ء کو اپنی کوٹھی میں ایک جلسے کا انعقاد کیا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں حامد علی خان بیرسٹر کی صدارت میں بھی ایک جلسہ ہوا۔ ۱۳ رمئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں بھی ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت نواب لطف علی خان نے کی۔ میک ڈونل کو علی گڑھ میں منعقد ہونے والے اس جلسے کی کارروائی ناگوار گزری۔ اس نے اس پر اپنے غصے کا اظہار بھی کیا۔ اس نے اس جلسے میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ جلسے کے صدر کو استعفیٰ تک دینے کے لیے مجبور کردیا گیا۔

یہ سب تو ہوا لیکن میک ڈونل کی ان دھمکیوں کا نواب محسن الملک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے ۱۸ راگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا اور اس کی صدارت بھی خود ہی کی۔ یہاں انھوں نے صدرِ جلسہ کی حیثیت سے حکومت کے فیصلے کے خلاف ایک طویل اور پرجوش تقریر کی۔ نواب محسن الملک کی اردو کے دفاع میں کی جارہی ان کوششوں نے میک ڈونل کو سخت مشتعل کردیا تھا۔ چنانچہ اس کے تدارک کے لیے ۲۶ راگست ۱۹۰۰ء میں وہ خود علی گڑھ گیا اور وہاں کے ٹرسٹیوں کے سامنے تقریر کی، جس میں اس نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے خلاف کھل کر ناراضگی کا اظہار کیا اور ان کو ڈرایا دھمکایا۔ اس

نے کہا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھا گیا تو کالج کو حکومت کی طرف سے جو امداد ملتی ہے وہ بند کردی جائے گی۔ اسی دوران میک ڈونل نے بعض اضلاع کا دورہ کرکے وہاں کے مسلم رئیسوں کو بھی دھمکایا اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ اس مہم میں اسے کامیابی بھی ملی۔ بالآخر یہ ہوا کہ نواب محسن الملک کو بھی مجبوراً اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن سے استعفیٰ دینا پڑا۔ حالانکہ اس کے بعد بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور وہ اردو زبان کے دفاع کی کوششیں کرتے رہے۔ اس کے لیے انھوں نے صرف جلسے جلوس اور یادداشتیں ہی نہیں بھیجیں بلکہ بذات خود لیفٹی ننٹ گورنر سے مل کر انھیں اصل صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن میک ڈونل نے ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی اور جواب میں ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ انھوں نے حکومت کی اجازت اور عام مسلمانوں کی رائے جانے بغیر حکومت کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ اس کی خفگی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ گورنر کی حیثیت سے لکھے جانے والے اپنے خطوں میں انھوں نے ان کے نام کے آگے 'محسن الملک' لکھنا بھی بند کردیا تھا۔ اس توہین کے بعد بھی نواب محسن الملک نے ہمت نہیں ہاری اور اردو کا سابقہ وقار بحال کرنے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

لیکن محسن الملک اور مسلمانوں کی ہزار کوششوں کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا اور میک ڈونل نے لیفٹی ننٹ گورنر کی حیثیت سے جو حکم دیوناگری ہندی کے حق میں صادر کردیا تھا وہ بحال رہا۔ مسلمانوں کی جدوجہد کا بس یہ نتیجہ نکلا کہ دیوناگری ہندی کے ساتھ اردو کو بھی عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں برقرار رکھا گیا۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے جس دیوناگری ہندی کا شمال مغربی صوبہ جات میں کہیں وجود نہ تھا اب وہ پنجاب کو چھوڑ کر بنگال، بہار، سی پی اور یوپی میں حکومت کرنے لگی تھی۔ بہرحال ۱۸۶۷ء سے ۱۹۰۰ء تک ہندوؤں کی طرف سے اردو والوں پر جو پے در پے حملے کیے جارہے تھے وہ کارگر ثابت ہوئے۔ اس کام میں برطانوی حکومت اور میک ڈونل نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور یہ سب میک ڈونل کی ناانصافی اور ہندوؤں کی یک طرفہ طرفداری کے سبب ہی ممکن ہوا تھا۔ بقول سلیم احمد:

''۱۸ راپریل ۱۹۰۰ء کو اس قرارداد پر عمل درآمد کے لیے سرکولر جاری کردیا گیا جو اردو کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔ اس فیصلے کے دوررس نتائج ہوئے۔ مسلمانوں کا تہذیبی اور معاشی شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کا یہ سب سے بڑا خسارہ تھا۔ اس کے بعد اردو کو ایوان اقتدار میں کوئی درجہ حاصل نہیں ہوسکا۔'' (گھر جو تقسیم ہوگیا، سلیم احمد، صفحہ ۱۷۵)

اس سلسلے میں آلوک رائے کا یہ قول کتنا صحیح معلوم ہوتا ہے:

"Mac Donnell intervention is a crucial, even inaugural, moment in a durable and long running process of the invention and exacernation of animoisities". (Hindi Nationalism, Alok Rai, Page 20)

لارڈ اینٹونی میک ڈونل تخت برطانیہ کا وفادار اور ہندوستانی انگریزوں کے درمیان ایک ہر دل عزیز شخص تھا۔ حکومت اسے ایسی جگہوں پر تعینات کرنا پسند کرتی تھی جہاں انھیں اپنی مرضی کا کچھ ایسا کام کرانا ہوتا تھا جو عام طور پر دوسروں کے لیے ناممکن ہوتا تھا۔ میک ڈونل نے بہار اور بنگال کے لیفٹی ننٹ گورنر کی حیثیت سے جس خوش اسلوبی سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے تھے، حکومت اس سے بہت خوش تھی۔ اس کی شمال مغربی صوبہ جات میں تقرری کے پس پشت بھی حکومت کا یہی مقصد کام کر رہا تھا۔ حکومت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک حساس صوبہ تھا جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں سے نپٹنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کی تفتیش کے مطابق یہ خطہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے نیک نام تھا اور حکومت کے استحکام کے لیے ان کے درمیان نفاق کے بیج بونا بہت ضروری تھا۔

میک ڈونل نے یہاں آکر انگریزی حکومت کے حق میں متعدد کام کیے۔ اس کی کامیاب کارکردگی کو دیکھتے ہوئے حکومت کی خواہش تھی کہ میک ڈونل کی تقرری دوبارہ بنگال میں کر دی جائے، اس کے لیے ۱۸۹۸ء میں لارڈ ایلگن نے اس سے درخواست بھی کی تھی لیکن میک ڈونل نے اپنی بیوی کی خرابی صحت کی وجہ سے معذرت کر لی تھی۔ اس دوران اس کی خانگی زندگی میں مسلسل کئی اتار چڑھاؤ آئے، جس کی وجہ سے وہ اپنی منصبی ذمہ داریاں ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا تھا۔ چنانچہ جب اسے ۱۹۰۱ء میں قحط زدہ علاقے کے انتظام و انصرام کے لیے اعلیٰ ترین عہدہ تفویض کیا گیا تو اسی سال اس نے خود اپنے نجی مسائل اور اپنی مسلسل بیماری کے پیش نظر اپنے عہدے سے سبکدوشی کی درخواست پیش کر دی اور فوراً ہی ہندوستان سے لندن چلا گیا، جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہیں لندن میں طویل بیماری کے بعد ۸۱ برس کی عمر میں ۹/جون ۱۹۲۵ء کو فوت ہوا اور بالآخر اردو کا یہ دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

☆☆☆

Dr. Nahid Fatima
Post-doc. Fellow, Dept. of Urdu,
BHU, Varanasi-221005,
Mob. 9450537558
E-Mail: nahidfatima17@gmail.com

منشی پریم چند: بچپن سے پہلی شادی تک

عزیز رضا

پریم چند کی ولادت ۳۱/جولائی ۱۸۸۰ء کو لمہی گاؤں میں ہوئی جو بنارس سے چار میل فاصلے پر ہے۔ وہ ایک غریب سفید پوش کایستھ خاندان میں پیدا ہوئے جن کے پاس ایک بڑے کنبے کی گزر بسر کرنے کے لیے صرف ۶ بیگہہ زمین تھی۔ آپ کے دادا گروسہائے لال پٹواری تھے، والد عجائب لال ڈاکخانے میں کلرک تھے، جہاں وہ پچیس روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ آپ کی والدہ کا نام آنندی دیوی تھا۔ وہ خوبصورت اور اچھے مزاج کی تربیت یافتہ خاتون تھیں۔

پریم چند کا بچپن گاؤں میں ہی گزرا۔ وہ ایک کھلنڈرے اور چنچل لڑکے تھے، کھیل کود کے بڑے شوقین تھے اور کھیتوں سے چیزیں تک چرالانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی، جہاں ایک مولوی صاحب سے کچھ اردو و فارسی پڑھی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں:

> ''میں اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میری عمر آٹھ سال ہوگی، چچازاد بھائی ہلدھر مجھ سے دو برس بڑے تھے۔ ہم دونوں علی الصباح باسی دو روٹیاں کھا کر دوپہر کے لیے گڑ اور جو کا چربن لے کر جاتے، کوئی حاضری کا رجسٹر تو تھا نہیں اور نہ غیر حاضری کا جرمانہ دینا پڑتا تھا، پھر خوف کس بات کا! کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑی کی بہار دیکھتے۔ گاڑیوں کے وقت کا جتنا علم ہم کو تھا، اتنا شاید ٹائم ٹیبل کو بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اتر جاتیں، اتنی تخیلی قوت آج ہوتی

تو ایسا ناول لکھ مارتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہت سر کھپانے کے بعد کوئی کہانی سوجھتی ہے۔ خیر، ہمارے مولوی صاحب درزی تھے مولوی گیری صرف شوقیہ کرتے تھے، ہم دونوں بھائی اپنے گاؤں کے......کمہاروں سے ان کی خوب تعریف کرتے، یا کہیے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے سفری ایجنٹ تھے، ہماری کوشش سے مولوی صاحب کو جب کام مل جاتا تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''جس روز کوئی اچھا بہانہ نہ سوجھتا اس روز مولوی صاحب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے جاتے، کبھی سیر آدھ سیر پھلیاں توڑ لیں تو کبھی پانچ گنے، کبھی جو یا گیہوں کی ہری ہری بالیں لے لیں۔''

ان کے لڑکپن کی تصویر ان کی کہانی 'چوری' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہائے بچپن تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا ٹوٹا گھر، وہ پوال کا بستر، وہ برہنہ جسم، برہنہ پا کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ کھتے جوتے پہن کر اس وقت جتنی خوشی ہوتی تھی اب فلیکس (Flex) کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی۔ گرم پتلے رس میں جو لذت تھی وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں۔''

بچپن کے زمانے میں پریم چند کے پسندیدہ کھیلوں میں گلی ڈنڈا اور پتنگ بازی تھے۔ افسانہ 'گلی ڈنڈا' میں لکھتے ہیں:

''نہ لان کی ضرورت ہے اور نہ مشن کارڈ کی، نہ نیٹ کی، نہ بلے کی۔ مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔''

پریم چند کو گُڑ کھانے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے گُڑ کھانے کی لت کا ذکر ایک اور کہانی میں وہ یوں کرتے ہیں:

''ماتا جی تین ماہ کے لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں مَیں ایک من گُڑ کھا گیا، یہ کھانڈ بنانے کا موسم تھا، نانا بیمار تھے۔ انھوں نے ماتا جی کو بلوا بھیجا تھا۔ میرے امتحان ہونے والے تھے اس لیے میں نہیں جا سکا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے ماتا جی نے ایک من گُڑ ایک مٹکے میں بھرا اور اوپر سے مٹی تھوپ دی اور مجھے سخت تاکید کی کہ اسے ہرگز نہ کھولوں۔ میرے کھانے کے لیے انھوں نے تھوڑا سا گُڑ ایک بالٹی میں الگ

رکھ دیا، یہ میں نے ایک ہی ہفتے میں ختم کر ڈالا تھا۔ ماتا جی بھی اس سے منع نہیں کر سکتی تھیں لیکن میں پانی پینے کے بہانے بار بار اسکول سے گھر آتا اور ہر دفعہ دو ایک ڈلی گُڑ کھا لیتا تھا۔ مجھے گُڑ کھانے کا شوق نہیں، ہوکا تھا۔''

پریم چند جب آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے تو ان کی والدہ دنیا سے رحلت کر گئیں۔ دو سال بعد ان کے والد نے دوسری شادی کر لی اور یوں ان کی زندگی میں سوتیلی ماں داخل ہو گئیں اور ان کے ادب میں سوتیلی ماں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اسی زمانے میں پریم چند کو داستانی ادب پڑھنے کا بڑا شوق ہو گیا۔ انھوں نے ایک تمباکو فروش کی دکان پر طلسم ہوشربا کے ختم نہ ہونے والے قصے سنے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب فیضی کی تصنیف ہے۔ یہ قصے اس نے اکبر اعظم کو خوش کرنے کے لیے لکھے تھے۔ پریم چند سال بھر تک یہ قصے سنتے رہے جس سے ان کے خیالات میں طوفان سا برپا ہو گیا۔

دوسرے افسانوی ادب میں پریم چند نے رتن ناتھ سرشار کی تصانیف اور Reynolds کی Mysteries of Court of London کا مطالعہ کیا۔ دورانِ قیام گورکھپور ایک کتب فروش بدھی لال سے ان کی دوستی ہو گئی، وہ اسکول میں بدھی لال کے رٹنے والی کتابیں فروخت کرتے تھے اور اس کے بدلے میں وہ انھیں گھر پر پڑھنے کے لیے ناول دیا کرتا تھا۔ اس دو تین سال کی مدت میں آپ نے دو ڈھائی سو ناول تو ضرور پڑھے ہوں گے۔

پندرہ سال کی عمر میں پریم چند نویں کلاس میں تھے، اس زمانے میں وہ کوینس کالج بنارس میں پڑھتے تھے۔ وہ ایک پوٹلی میں گُڑ اور چنے لے کر گھر سے صبح سویرے چل پڑتے، دن بھر اسکول میں پڑھتے اور شام کو دیر سے گھر پہنچتے۔ روز رات کو تیل کے دیے کی روشنی میں پڑھا کرتے تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں ہی پریم چند کی شادی ہو گئی۔ یہ رشتہ ان کے سوتیلے نانا نے طے کیا تھا۔ بعض اشارے ایسے ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ لڑکی نہ تو خوبصورت تھی اور نہ تربیت یافتہ اور اس پر جھگڑالو بھی تھی۔

پریم چند کی پہلی شادی یکسر ناکام رہی۔ ایک بار گرمی کے موسم میں ان کی بیوی نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکُشی کر لینا چاہا۔ اس واقعے کا ذکر انھوں نے دیا نرائن نگم کے نام ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

''برادرم، اپنی بیتی کس سے کہوں، ضبط کیے کیے کوفت ہو رہی ہے۔ جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تردداد کا تانتا بندھا۔ عورتوں نے ایک دوسرے کو جلی کٹی سنائی۔ ہماری مخدومہ نے جل بُھن کر گلے میں پھانسی لگا لی۔ ماں نے آدھی رات کو بھانپا، دوڑیں، اس کو آزاد (رہا) کیا۔ صبح ہوئی۔ میں نے خبر پائی، جھلایا، بگڑا، لعنت

ملامت کی، بیوی صاحبہ نے اب ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی، وہ رو رو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج ان کو گئے آٹھ روز ہوئے نہ خط نہ پتر۔ میں ان سے پہلے ہی خوش نہ تھا۔ اب تو صورت سے بیزار ہوں۔ غالباً اب کی جدائی دائمی ثابت ہوگی، خدا کرے ایسا ہی ہو! میں بلا بیوی کے رہوں گا۔''

پہلی بیوی سے پریم چند کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ نہ صورت شکل میں نہ ذہنی تربیت کے لحاظ سے۔ لہٰذا یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ یہ صورت حال بیوی کے لیے واقعی ایک المیہ تھی اور عمر بھر کے لیے ایک لعنت بھی۔ لیکن ان کی پہلی شادی کے متعلق اطلاعات ناکافی ہیں اور خود پریم چند نے بھی اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ اس طرح ان کی پہلی شادی کا معاملہ ایک راز بن کر رہ گیا ہے۔

☆☆☆

Dr. Aziz Raza
Assistant Prof. Jawahar Lal Nehru
Memorial P.G. College, Barabanki- 225003
Mob. 9415447285

کلامِ غالبؔ کا اولین شارح: خواجہ قمر الدین راقمؔ

شہناز بانو

کلام غالب کے شارحین کی فہرست بہت طویل ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ خود غالبؔ اپنے کلام کے اولین شارح ہیں۔ یہ بات اس بنیاد پر کہی جاتی ہے کہ غالبؔ اپنے بعض مکاتیب میں اپنے شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کو اپنے اشعار کے معانی و مفاہیم سے آشنا کراتے رہے۔ غالب کے علاوہ ان کے شاگرد عزیز اور اردو کے اولین ناقد مولانا حالی نے بھی 'مقدمہ شعر و شاعری' اور 'یادگار غالب' میں غالب کے بعض اشعار کی شرح پیش کی ہے۔ مگر شمس الرحمٰن فاروقی کی تلاش و تحقیق کے مطابق کلام غالب کے سب سے پہلے باقاعدہ شارح خواجہ قمر الدین راقمؔ دہلوی ہیں۔

راقم دہلوی کی پیدائش ۱۸۳۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد مرزا بدر الدین خاں مخاطب بہ خواجہ امان تھے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے اور مرزا غالب کے عزیز تھے۔ غالب نے غلام غوث بے خبر کے نام اپنے ایک خط میں انھیں اپنے رشتہ دار کا بھتیجا بتایا ہے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے قمر الدین راقمؔ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

''......خواجہ بدر الدین خاں، راقم کے والد ماجد نے بھی بہ عمر چونسٹھ سال ماہ اگست ۱۸۷۹ء میں وفات پائی اور ان کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر رہی۔ ایک دختر صاحب اولاد اور ایک فرزند اکبر خواجہ قمر الدین خاں راقمؔ باقی رہے۔ خواجہ بدر الدین خاں اپنے وقت کے مجمع کمالات تھے۔ خوشنویسی میں ایسے ہی تھے، مصوری اور ستار نوازی میں کامل، فن رعنائی اور خوش تقریری میں لاجواب تھے، جیسا کہ ان کے چچا مرزا اسداللہ خاں غالب نے جلد اول 'بوستان خیال' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میرا بھتیجا وصف کمالات میں یکتا ہے۔ ستار بجایا تو ایسا بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا،

مصوری میں مانی کو پرے بٹھایا۔ الیٰ آخرہ۔ حق یہ ہے کہ خواجہ بدرالدین ہمہ صفت
موصوف تھے۔''(۱)

اوپر ذکر ہوا کہ غالب نے 'بوستان خیال' کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ کتاب غالب کو بہت پسند تھی۔ اپنے بعض خطوط میں انھوں نے اس کتاب کا ذکر بھی کیا ہے اور خریداری کی فرمائش و سفارش بھی کی ہے۔ خواجہ امان کے والد یعنی قمرالدین راقم کے دادا خواجہ مرزا حاجی خاں رشتے میں غالب کے بھائی ہوتے تھے اور بقول راقم مرزا غالب کی پرورش وہی کرتے تھے۔ مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقم نے لکھا ہے:

''راقم اور مرزا غالب ایک ہی نسل کے تھے۔ یعنی غالب کے دادا اور راقم کے پردادا
کے والد دونوں سگے چچازاد بھائی تھے۔ جیسا کہ خود راقم نے مفصل بیان کیا ہے۔''(۲)

خواجہ راقم نے ابتدائی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ انہیں والد کی ہی طرح فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت کاملہ حاصل ہوگئی۔ خاص طور سے اردو پر انھیں بہت ناز تھا۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہم زباں سے، زبان ہم سے ہے
ہر زباں پر فسانہ ہیں ہم لوگ

والد کے علاوہ راقم کو اپنے دادا یعنی غالب کی شاگردی کا شرف بھی حاصل تھا۔ شاعری کے علاوہ دیگر علوم میں بھی وہ غالب سے درس لیا کرتے تھے۔

حصولِ علم کے بعد سولہ سال کی عمر میں راقم نے بہادر شاہ بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ جس کے عوض انھیں پندرہ روپیہ ماہانہ سرکار شاہی سے چند برسوں تک ملتا رہا۔ کچھ دنوں بادشاہ کے ولی عہد مرزا فتح الملک کی ملازمت میں بھی رہے۔ مرزا فتح الملک کے بعارضۂ ہیضہ انتقال کر جانے کے بعد راقم اپنے والد خواجہ مرزا بدرالدین خاں المعروف خواجہ امان کے پاس ریاست الور چلے گئے، جہاں والی الور راجہ بنے سنگھ کے فرزند ارجمند شیودان سنگھ کی تعلیم پر مامور کیے گئے۔ اس وقت شیودان سنگھ کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چند برس میں راجہ بنے سنگھ فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہو گئے، پھر دھیرے دھیرے حالات بدلتے گئے۔ الور میں فساد پھوٹ پڑا اور بقول راقم ''اب الور جائے اماں نہیں رہا۔'' چنانچہ راقم اور ان کے والد خواجہ امان کسی طرح الور سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ خواجہ امان نے دہلی کا رخ کیا اور راقم جے پور آ گئے۔ اس اثنا میں مہاراجا شیودان سنگھ اپنی جیب خاص سے راقم کی مالی اعانت کرتے رہے۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد راقم بھی دہلی آ گئے اور یہاں انھوں نے ایک پریس قائم کیا۔ ان کے والد اس زمانے میں فارسی

داستان 'بوستان خیال' کا اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ 'بوستان خیال' کے مصنف میر تقی خیال ہیں، جن کا تعلق گجرات سے ہے، وہ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے۔ اس وقت دہلی میں 'داستان امیر حمزہ' کا ہر طرف چرچا تھا۔ اسی کے جواب میں میر تقی خیال نے داستان 'بوستان خیال' فارسی میں تصنیف کیا۔

بہر حال، راقم اس ترجمے کے کام میں ان کی معاونت کرنے لگے۔ والد ترجمہ کرتے جاتے اور یہ صاف کرتے اور چھپواتے جاتے۔ 'بوستان خیال' آٹھ جلدوں پر مشتمل تھی۔ خواجہ امان نے چھ جلدوں کا ترجمہ کیا، پانچ جلدیں چھپ چکی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ چھٹی جلد ان کے انتقال کے بعد راقم نے شائع کرائی۔ بقیہ دو جلدوں کا ترجمہ راقم نے خود کیا اور شائع کرایا۔

'بوستان خیال' کی بقیہ دو جلدوں کے ترجمہ اور اشاعت کے بعد خواجہ راقم مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سکریٹری میر تراب علی خاں سالار جنگ کے بلاوے پر حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ تقریباً دو سال وہاں نواب سالار جنگ کے ہاں امیدواری کرتے رہے۔ پھر جے پور چلے آئے اور آخر دم تک وہیں رہے۔ عمر کی آخری منزل میں جسم میں قدرے رعشہ ہو گیا تھا۔ نبیرۂ راقم مرزا رفیق بیگ نے اس باب میں لکھا ہے:

''راقم لمبے قد کے، خوش رو اور ہنس مکھ تھے۔ رنگ گندمی تھا، آخر عمر میں
اعضا میں قدرے رعشہ ہو گیا تھا، جس سے لکھنے پڑھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ چائے
کے بہت شوقین تھے، طبیعت میں نفاست تھی۔ اپنی عمر کے اختتام تک اپنی پرانی وضع
کے پابند تھے۔''(۳)

راقم دہلوی جے پور میں اکتیس سال تک مقیم رہے۔ جناب مرزا رفیق بیگ کی اطلاع کے مطابق جے پور میں انھوں نے جو مکان اول اول کرایہ پر لیا تھا اکتیس سال اسی مکان میں گزار دئے اور آخر کار اسی مکان میں ان کا انتقال بھی ہوا۔ انتقال کا سال ۱۹۱۰ء اور مہینہ مارچ ہے۔ جے پور میں ہی دفن کیے گئے۔

خواجہ راقم کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد بقول مرزا رفیق بیگ چھ ہے۔ اس میں اول 'بوستان خیال' کی آخری دو جلدیں ہیں جن کا فارسی سے اردو ترجمہ راقم نے اپنے والد خواجہ امان کے انتقال کے بعد کیا۔ دوسری تصنیف 'کلیات راقم' ہے۔ یہ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل راقم کا شائع شدہ شعری اثاثہ ہے۔ تیسری تصنیف 'سبعۂ سیارہ' ہے۔ یہ سیاروں کی چال اور ان کے حالات سے متعلق کتابچہ ہے۔ یہ بھی مطبوعہ ہے۔ چوتھی کتاب 'عقد ثریا' ہے، یہ عورتوں کی زبان میں قصے کے پیرایہ میں مقفی و مسجع نثر سے بھرپور ایک اہم مطبوعہ کتاب ہے۔ پانچویں تصنیف 'مرقع نعت' ہے، اس میں نعت اور تصوف کا بہترین امتزاج اور عمدہ ترین ذخیرہ ہے۔ اس کی اہمیت اس میں شامل 'معراج نامہ' کی وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

قمرالدین راقم کا سب سے اہم کارنامہ 'شرح دیوان غالب' موسوم بہ 'بوستان خرد' تھا۔ اس میں 'دیوان غالب' کی مکمل شرح پیش کی گئی تھی۔ ساتھ ہی خواجہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامۂ غالب بھی اس کا حصہ تھا۔ شرح تو اشاعت کی منزل سے گزر نہ سکی اور کہیں تلف ہوگئی۔ البتہ پانچ سات صفحات پر مشتمل 'مرزا غالب کا نسب نامہ' ضائع ہونے سے بچ گیا۔ اس نسب نامہ کا ابتدائی جملہ یوں ہے:

> ''اس بندۂ خاکسار بے بضاعت خواجہ قمرالدین راقم نے جب 'شرح دیوان غالب' ختم کرلی اور ہر شعر کے معنی بخوبی وخوش اسلوبی حل کرلیے، اس وقت خیال آیا کہ مرزا غالب کا اور اپنے بزرگوں کا نسب خاندانی بھی ظاہر کرنا ضرور ہے......'' (۴)

ان ابتدائی سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ راقم نے 'دیوان غالب' کے ہر ہر شعر کی شرح مکمل کرلی تھی مگر افسوس کہ یہ شرح ضائع ہوگئی۔ اس شرح کے ضائع ہوجانے کی داستان بھی نبیرۂ راقم کی زبانی سنیے:

> ''راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کرکے حیدرآباد سے ساتھ لائے تھے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے (جو رشتے میں راقم کے بھتیجے ہوتے ہیں) اتفاقاً ذکر کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور راقم سے کہا کہ وہ مسودہ مجھے دے دیجیے میں اس کو چھپواتا ہوں۔ راقم نے مسودہ ان کے حوالے کردیا اور واپس جے پور چلے گئے۔ اس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کیے اور راقم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیرالدین خاں صاحب آثم نے جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بہ قدم تھے (افسوس کہ انھوں نے بھی ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی لیکن وہ شرح نواب صاحب کے پاس سے غالباً کہیں گم ہوگئی۔ اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ جو بہت کٹا چھٹا ہے، اب نکلا ہے لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ شائع کیا جاسکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامہ اسداللہ خاں غالب دستیاب ہوا ہے، جو اسی شرح کا دیباچہ ہے۔'' (۵)

خواجہ قمرالدین راقم اور ان کی شرح 'بوستان خرد' کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ اول تو یہ شرح شائع نہیں ہوسکی، دوسرے اس کے بعض اقتباسات جو سامنے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں شعر فہمی کے بجائے فرضی باتیں زیادہ تھیں۔ اس سلسلے میں مثال پیش کرتے ہوئے پروفیسر ظفر احمد صدیقی ڈاکٹر عبدالغنی کے تحقیقی مقالہ 'بوستان خرد: غالب کی ایک غیر معروف شرح'، مطبوعہ سہ ماہی 'اردو' غالب نمبر سے ایک شعر کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ ذیل میں انھیں کے حوالے سے غالب کا وہ شعر اور

اس کی شرح نقل کررہی ہوں:

> کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
> ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ شعر قصہ طلب ہے جس کو کوئی نہیں جانتا کہ شاعر کیا کہتا ہے اور مقصود کیا ہے؟ یعنی غالب مغفور نے اپنے برادرزادوں خواجہ شمس الدین خاں اور خواجہ بدرالدین خاں پدروعم راقم سے جاگیر لینی چاہی۔ کئی برس جھگڑا طے نہ ہوا۔ حضرت کلکتہ گئے۔ وہاں سے ناکام آئے۔ انجام کار جاگیر ضبط ہوگئی اور اس کی نقدی سرکار انگریز نے خاندان میں نام بہ نام تقسیم کردی۔ اسی زمانہ تہی دستی اور پریشاں حالی کا بیان کیا گیا ہے۔ واقعی خاندان میں تاانفصال مقدمہ بہت محتاجی رہی ہے کہ مغفور اسی محتاجی میں پراگندہ حواس رہے، یہاں تک کہ جینے سے بیزار ہوئے۔ کتنے ہی دن پینے کو شراب نہ ملی۔ آخر اس غم میں ایک دن شام کو صندوقچے سے سنکھیا کی ڈلی نکالی اور کھا گئے۔ اس کے اوپر ایک گلاس برانڈی شراب کا پی لیا اور پلنگ پر دراز ہوگئے۔ رات بھر حقہ پیتے رہے اور نشہ کی حالت میں اجل کی راہ دیکھا کیے۔ اب آتی ہے، اب آتی ہے۔ مگر اجل خود اس دلیری سے دبک گئی۔ حضرت صبح کو چاق وتوانا اٹھ کھڑے ہوئے۔ صرف کان بہرے ہوگئے۔ جان سلامت رہی۔ بس اس شعر میں یہی تلمیح ہے۔'' (۶)

شعر کی ایسی فرضی اور مضحکہ خیز تشریح کی تردید کرتے ہوئے پروفیسر ظفر احمد صدیقی بیان فرماتے ہیں:

> ''یہ شرح اور تلمیح دونوں فرضی ہیں۔ اس لیے کہ یہ شعر نسخہ حمیدیہ میں موجود ہے، جس کا زمانہ ۱۸۲۱ء سے پہلے کا ہے اور پنشن کا قضیہ اس کے بعد پیش آیا۔ خوب وزشت سے قطع نظر، یہ شرح نہ شائع ہوئی اور نہ اب دستیاب ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت صرف تاریخی ہے۔'' (۷)

بہر حال، خواجہ راقم دہلوی 'دیوان غالب' کے وہ اولین شارح ہیں جن کی شرح منظر عام پر نہیں آسکی، اس کی صرف اور صرف تاریخی حیثیت ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) من کیستم، خواجہ قمرالدین راقم، مشمولہ: احوال غالب، مرتبہ: پروفیسر مختارالدین احمد، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۹

(۲) ایضاً، ص ۲۶۹

(۳) خواجہ قمرالدین راقم، مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقم، مشمولہ: احوال غالب، مرتبہ: پروفیسر مختارالدین احمد، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۱

(۴) مرزا غالب کا نسب نامہ، خواجہ قمرالدین راقم، مشمولہ: احوال غالب، مرتبہ: پروفیسر مختارالدین احمد، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۳۶

(۵) خواجہ قمرالدین راقم، مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقم، مشمولہ: احوال غالب، مرتبہ: پروفیسر مختارالدین احمد، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۳

(۶) مقدمہ از شرح دیوان اردوئے غالب، نظم طباطبائی، مرتبہ ظفر احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جنوری ۲۰۱۲ء، ص ۳۰

(۷) ایضاً، صفحہ ۳۱

☆☆☆

SHAHNAZ BANO
Research Scholar,
Magadh University, Bodh Gaya,
Bihar, Mob. 9304621177
E-Mail: bano.shahnaz025@gmail.com

رام پور کی دو لائبریریاں۔تعارف و تجزیہ

عبیدالرحمٰن

چہار درویش (بی ایچ یو، شعبۂ عربی کے چار ہم مذاق ریسرچ اسکالرس) کی ٹیم ۱۴ ردسمبر ۲۰۱۸ء کی ایک سرد صبح 'رام پور' کے اسٹیشن پر اتری، حسن اتفاق یا کسی درویش کی دعا سے ٹرین 'رام پور' کے اسٹیشن پر تھوڑے وقفے کے لیے رک گئی، جب کہ وہاں اس کا اسٹاپ نہیں تھا، لیکن منزل مقصود پر اتر جانے کی وجہ سے ہمارا کافی وقت بچ گیا۔ جمعہ کا دن بھی تھا، ہم نے ای رکشہ والے سے 'رضا لائبریری' جانے کو کہا تو اس نے 'رائے بریلی' یا اس سے ملتا جلتا لفظ کہا، میں چونک سا گیا بھائی کہاں اتر گئے۔ مرشد نے بتایا کہ لائبریری کا یہ لوگ غلط تلفظ 'رائے بریلی' کر رہے ہیں۔

لائبریری پہنچے تو معلوم ہوا کہ جمعہ کو لائبریری بند رہتی ہے۔ اس طرح ہمارا پورا دن ضائع ہوتا نظر آیا، مگر ہماری بات لائبریری کے موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر حسن عباس صاحب سے ہو چکی تھی، جو کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر ہیں اور تین سال کی عارضی رخصت پر 'رام پور رضا لائبریری' کے ڈائرکٹر ہیں۔ نہایت ہی شفیق، کرم فرما اور کتاب دوست انسان ہیں۔ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دسیوں تحقیقی کام کیے ہیں۔ کتابوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرس اور طلبہ سے بھی بہت محبت سے پیش آتے ہیں اور ان کی مدد کرنا ان کی فطرت ثانیہ ہے۔

پروفیسر حسن عباس صاحب وہیں اپنے کوارٹر کے باہر نظر آئے اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ چوں کہ رام پور رضا لائبریری کے حفاظتی انتظامات نہایت سخت ہیں، اس لیے انھوں نے سیکورٹی اہلکاروں کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا اور ہمارے لیے لائبریری کے مہمان خانے میں رہنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ ان کی محبت تھی کہ انھوں نے اپنے ڈرائنگ روم میں چائے پلائی اور گھنٹوں بات کرتے رہے۔ جب کہ وہ وقت کے بہت قدر داں ہیں اور اکثر وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے ہیں، مگر یہ ان کی اسکالرس سے

محبت کی دلیل ہے کہ وہ ہم سے بات کرتے رہے اور ریسرچ اور تحقیق سے متعلق ہدایات دیتے رہے۔ اسی دوران جمعہ کی اذان ہوگئی اور ہم لوگ رام پور کی شاہی جامع مسجد کے لیے روانہ ہوگئے۔ نہایت شاندار مسجد ہے اور اسلامی فنِ تعمیر کا شاہکار ہے، مسجد کے گیٹ پر موجود پتھر پر مختصر تاریخ اس طرح کندہ ہے: ''جامع مسجد مصطفیٰ آباد عرف رام پور، یوپی روہیلوں کی تعمیر کردہ شاندار عمارت جو اندر داخل ہونے کے بعد آپ کو نظر آئے گی رام پور کی جامع مسجد ہے، رام پور کی پہلی جامع مسجد ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶ء میں تعمیر ہوئی تھی جس کی تاریخ اس مصرع سے برآمد ہوتی ہے۔ ع- یک مسجد فیض کعبہ نو''

اس مسجد کو رام پور کے پہلے نواب فیض اللہ خان نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک سو آٹھ سال بعد نواب کلب علی خان نے اس مسجد کے پہلو میں دوسری وسیع و عریض مسجد تعمیر کرائی جو ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۴ء میں بن کر تیار ہوئی۔ مسجد کے اوپر تین شاندار گنبد اور چار طویل مینار بنوائے اور ان پر عالیشان طلائی کلس چڑھائے۔ صدر دروازے کے اوپر ایک خوش نما گھنٹہ گھر بنوایا جس پر دو رخہ گھنٹہ لندن سے منگوا کر نصب کروایا۔ اس گھنٹہ میں دونوں جانب سے وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۱۳ء میں نواب حامد علی خان نے جامع مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرایا جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ (بہ حوالہ ضیائے وجیہ، رام پور ۱۹۸۱ء) اس وقت جامع مسجد کا انتظام معززینِ شہر کی ایک کمیٹی کے سپرد ہے، جس کی نگرانی میں جامع مسجد کی ترقی و تحفظ اور خوش نمائی کی پرزور کوشش ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کمیٹی کی خدمات کو قبولیت عطا فرمائے اور جامع مسجد کو ہمیشہ آباد رکھے۔

جمعہ کی نماز کے بعد ہم مہمان خانے واپس آگئے۔ مہمان خانہ بلکہ لائبریری کی ساری عمارتیں نوابی شان و شوکت کا مظہر ہیں، جس میں ضرورت سے زیادہ کشادہ کمرے، کافی اونچی اونچی چھتیں، بلند دروازے، وسیع و عریض حمام موجود ہیں۔ چہار درویش اسی وسیع و عریض کمرے میں اپنے مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ لائبریری کی زیارت اصل مقصود تھی، کیوں کہ ایک طالب علم، ایک اسکالر کے لیے سب سے بڑا اثاثہ کتاب ہی تو ہے۔ وہ در در بھٹکتا ہے کہ کوئی کتابوں کا ذخیرہ اس کی علمی پیاس بجھا دے، مگر یہ کتابیں تو بحر بیکراں ہیں، غواص کو لعل و گہر سے مطلب ہوتا ہے، سمندر کی گہرائی اور گیرائی اس کے حوصلے کو نہیں توڑ پاتی ہے۔ اسی طرح الفاظ کے موتی، افکار کے خزانے، علم کے دریا، آگہی کے طالب کے لیے کتابیں ہی منزلِ مقصود ہیں۔ اسی کھوج اور چاہت میں اپنی کشتی سمندر میں ڈال دیتا ہے، جو ڈگمگاتے، بل کھاتے کبھی کنارے لگ جاتی اور وہ شیر و شکر ہو جاتا ہے، یا پھر اسی میدانِ تیہ میں حیران و سرگرداں اپنی زندگی تیاگ دیتا ہے:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو   کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

رام پور کی رضا لائبریری بھی اسی بحر بیکراں کا ایک حصہ ہے، کتابوں کا زندۂ جاوید مرکز ہے۔ بقول حقانی القاسمی ''زندہ لفظوں کا روشن مینار ہے۔'' ہندوستان میں اسلامی اقدار اور ثقافت کی تاریخ کی وارث بھی ہے، اس کی بنیاد ۱۷۷۴ء میں رام پور ریاست کے نواب فیض اللہ خان نے رکھی اور اس کے بعد تمام نوابین رام پور خصوصاً نواب رضا علی خان نے اس لائبریری کی تعمیر و ترقی اور احیا میں خصوصی دلچسپی لی، پروفیسر سید نور الحسن سابق وزیر تعلیم حکومت ہند کی کوششوں سے یہ لائبریری یکم جولائی ۱۹۷۵ء میں ایکٹ آف پارلیمنٹ کے تحت حکومت کی تحویل میں چلی گئی۔ یہ لائبریری خود مختار ادارہ ہونے کے ساتھ وزارت ثقافت، حکومت ہند کے ماتحت ہے، اس لائبریری کے بورڈ کے چیئرمین عزت مآب گورنر اتر پردیش ہوتے ہیں، مجھے رضا لائبریری کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں، کیوں کہ اس کی مفصل تاریخ کتابوں میں موجود ہے، یہ صرف ایک تاثر ہے جو رام پور جانے کے بعد میرے ذہن کے صفحات پر محفوظ تھا، اسی کو سپرد قرطاس کر رہا ہوں۔ درحقیقت رام پور میں دو لائبریریوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

(۱) رام پور رضا لائبریری (۲) صولت پبلک لائبریری

مقدم الذکر کے مداح شبلی اور آزاد جیسی شخصیات ہیں تو موخر الذکر کی زبوں حالی کا ترجمان خود گردشِ ایام ہے، 'رضا لائبریری' بقول حقانی القاسمی ''زندہ لفظوں کا روشن مینار ہے۔'' تو 'صولت پبلک لائبریری' بقول مورگن ''کتابوں کا قبرستان'' ہے۔ 'رضا لائبریری' کے ہماری ملی، علمی، ثقافتی وراثت ہونے پر تو وہیں 'صولت پبلک لائبریری' کی زبوں حالی اور بربادی پر انتہائی رنج و قلق بھی ہے جو قومی وراثت کا حصہ نہ بن سکی، میں یہاں 'صولت پبلک لائبریری' کا تذکرہ اتنے قلق سے اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ لائبریری ان پبلک لائبریریوں کی طرح نہیں ہے جو گلی کے نکڑ پر چند ناولوں، افسانوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، بلکہ نوادرات اور مخطوطات کی آماجگاہ ہے جو برباد ہو رہی ہے یا یوں کہیے برباد کر دی گئی ہے۔

رضا لائبریری کی عمارت کافی بلندی پر واقع فنِ تعمیر کا شاہکار اور نوابی شان و شوکت کی نشانی ہے، پیلے اور میرون رنگوں کی قلعی، اگلے حصے میں خوبصورت پارک اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ یہ لائبریری ہزاروں نوادرات و مخطوطات اور کتابوں کو اپنے اندر سمیٹے اسلامی اور قومی وراثت کی امین و پاسدار ہے جس کے بارے میں شبلی نعمانی کہتے ہیں:

> ''میں اس کتب خانے سے بار بار متمتع ہوا ہوں، ہندوستان کے کتب خانوں میں اس سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہیں۔ میں نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہیں، لیکن کسی کتب خانے کو مجموعی حیثیت سے اس سے افضل نہیں دیکھا۔''

موتی کی قدر و قیمت ایک جوہری ہی پہچان سکتا ہے۔شبلی کے الفاظ اس لائبریری کی عظمت کو بتا رہے ہیں۔ اس میں عربی، فارسی، ہندی اور دیگر زبانوں کے بیس ہزار سے زائد مخطوطے،نوادرات اور پینٹنگس موجود ہیں۔صرف عربی مخطوطوں کی جو فہرست مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے مرتب کی ہے، وہ ۶رجلدوں میں ہے۔

سابق ناظم کتب خانہ مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم کی مرتب کردہ عربی مخطوطوں کی فہرست انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے استفادے میں کچھ تکلف محسوس ہوتا ہے۔'خدا بخش لائبریری پٹنہ' کے عربی مخطوطات کی فہرست بہ زبان عربی ہے، اس لیے اس سے استفادہ آسان ہے۔اسی طرز پر 'رضا لائبریری' کی فہرست مرتب ہوجائے تو یہ بڑا کام ہوجائے گا۔ یوں تو مولانا امتیاز علی عرشی کا کام نہایت عمدہ اور مکمل ہے۔انھوں نے ہر مخطوطہ پر جس طرح کا تبصرہ لکھا ہے وہ کوئی کہنہ مشق اور لائبریری سائنس پر عبور رکھنے والا شخص ہی کرسکتا ہے۔ہم موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر حسن عباس صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں۔اگر اس فہرست کی زبان کا مسئلہ حل ہوجائے تو اس کی افادیت دوچند ہوجائے گی۔

شبلی کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس لائبریری سے متمتع ہوتے رہے ہیں، ان کا اس لائبریری کی مدح میں رطب اللسان ہونا اس کی عظمت کو بتلاتا ہے۔نہ جانے کتنے تشنہ کام کو اس در سے سیرابی حاصل ہوئی ہے اور وہ کشاں کشاں اس علمی دربار میں چلے آتے رہے ہیں۔لکھتے ہیں:

''ایک عرصہ کے بعد مجھے اس قیمتی کتب خانے کے معائنہ کا پھر موقع ملا، ہندوستان میں جو گنتی کے ذخائر ہیں ان میں ایک گراں مایہ ذخیرہ یہ ہے۔امید ہے کہ حالات کی تبدیلیوں نے اب جو نئی صورت حال پیدا کردی ہے، وہ اس کتب خانہ کی مزید اصلاح و ترقی کی موجب ثابت ہوگی۔''

رضا لائبریری کی عظمت، شان و شوکت کی کہانی کے سامنے صولت پبلک لائبریری کی بربادی کی داستان بھی جاننا ضروری ہے۔ ہندو پاک کی تقسیم کے وقت جب سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا جارہا تھا، اس وقت تو یہ لائبریری بچ گئی، کیوں کہ یہ تحصیل کی عمارت میں تھی، لیکن قومی بے توجہی، بے حسی اور مردہ ضمیری کے سامنے شکست خوردہ ہوگئی اور اس پر کیڑوں مکوڑوں، جالوں اور گرد و غبار کا قبضہ ہوگیا ہے۔

انجان شہر میں ہم نے اس لائبریری تک پہنچنے کے لیے جی پی ایس (GPS) کا سہارا لیا اور گلی گلی گھومتے گھومتے نہ جانے کہاں پہنچ گئے، کچھ کتاب کی دکانیں نظر آئیں تو ان سے صحیح رہنمائی مل سکی، کسی طرح ہم 'صولت پبلک لائبریری' پہنچ ہی گئے۔لائبریری کیا ہے درحقیقت کتابوں کا قبرستان ہے، اس میں دو تین

لوگ بیٹھے ہوئے ملے، اخلاق سے عاری، جیسے وہ قبرستان ہی کے باسی ہوں۔ پرانی، گرد آلود الماریوں میں ہزاروں قیمتی نسخے اس طرح دفن ہیں کہ ایک محقق کی جان کی ہی بن آئے، ریڈنگ روم کے تین طرف دیوار ہے، چوتھی مشرقی دیوار مارچ ۲۰۱۳ء میں گرگئی تھی اور کمیٹی کے پاس اتنا بجٹ نہیں ہے کہ اس کی مرمت کروائی جاسکے۔البتہ دیوار گرنے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لائبریری میں کچھ روشنی ہوگئی۔'صولت پبلک لائبریری' کے نام سے ایک فیس بک پیج ہے، جس میں اس لائبریری کی مختصر تاریخ اس طرح درج ہے:

''ریاست پیریڈ میں رام پور کی عوام 'رضا لائبریری' سے استفادہ نہیں کرسکتی تھی۔اس لیے ایک پبلک لائبریری کی ضرورت محسوس کی گئی جس سے عوام مستفید ہوسکیں۔اسی کے پیش نظر رام پور کے ہر دلعزیز عوامی رہنما صولت علی خان نے ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو محلہ راج دوارہ میں افسر علی کی کوٹھی میں ایک 'کتب خانۂ عام' کا قیام کیا، جو صرف کتب خانہ نہیں تھا بلکہ رام پور کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی علامت بھی تھا۔لائبریری کی پرانی کتابوں پر آج بھی 'کتب خانۂ عام' کی مہر موجود ہے۔ کچھ وقت بعد جگہ کی قلت کی وجہ سے لائبریری کو صفدر جنگ بازار میں شہزادہ وجّن خان کے مکان میں (جہاں اب شاداب مارکیٹ ہے) منتقل کردیا گیا۔ ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء میں ایک عوامی جلسۂ عام میں قرارداد منظور کرکے اس لائبریری کو 'صولت پبلک لائبریری' کا نام دیا گیا۔لائبریری کے موسس صولت علی خان کے دعوت نامے پر ۶رنومبر ۱۹۳۵ء کو نواب رضا علی خان نے لائبریری کا دورہ کیا۔ یہاں پر بھی جگہ کوئی خاص کشادہ نہیں تھی، اس لیے نواب رضا علی خان نے جامع مسجد رام پور کے قریب حضور تحصیل کی بالائی عمارت لائبریری کو الاٹ کردی۔ ۱۹۷۵ء میں حکومت اتر پردیش نے لائبریری اور اس سے متصل عمارت کو لائبریری کی ملکیت تسلیم کرلیا ہے۔یہ ادارہ مستحق ہونے کے باوجود روز اول سے ارباب اقتدار کی غفلت کا شکار رہا ہے، لیکن شہر کے مخیر لوگوں کی توجہ اس کو حاصل رہی ہے۔

۲۵رنومبر ۲۰۱۷ء کو اسکرول.ان (Scroll.in) میں ڈینیل جوکوبیس مورگن (Daniel Jacobius Morgan) کا ایک آرٹیکل 'صولت پبلک لائبریری' کی صورت حال پر پوسٹ کیا گیا ہے۔ مورگن رام پور اپنے ریسرچ کے مواد کی تلاش میں آئے تھے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے 'خواصہ حزب البحر' کے اکلوتے مخطوطے کی تلاش میں 'صولت پبلک لائبریری' پہنچے تھے۔ شکاگو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر کو یہ پتا تھا کہ ۱۹۶۶ء میں عابد رضا بیدار کے مرتب کردہ کیٹلاگ میں اس نسخے کا ذکر ہے اور وہ کشاں کشاں رام پور چلا آیا۔اس کو وہ نسخہ تو نہ ملا لیکن جاتے جاتے اسکرول.ان (Scroll.in) میں ۲۵رنومبر ۲۰۱۷ء کو ایک آرٹیکل:

"Welcome to the graveyard of rare books, also known as the Saulat Public Library, Rampur"

کے عنوان سے دے گیا جس میں ہماری بے حسی اور قومی غیرت کو للکار گیا کہ جس لائبریری میں ہزاروں نوادرات ہوں، ان کو تو قومی ورثہ ہونا چاہیے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ مزید برآں اگر اس کی حفاظت کے فوری اقدام (جیسے نوادرات اور مخطوطات کو ڈیجیٹائز کرنا) نہ کیے گئے تو انڈیا کی انٹلیکچول ہسٹری کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ ہندوستان میں نہ جانے ایسے کتنے کتب خانے رہے ہوں گے جو نوادرات کا مجموعہ تھے، جن کو ظالم حکمرانوں نے نذر آتش نہیں کیا، بلکہ ہماری بے حسی کا شکار ہوکر برباد ہو گئے۔ ایسے موقع پر احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر کیا گزرتی رہی ہوگی جب وہ یورپ کی لائبریریوں میں اپنے آبا کی کتابوں کو دیکھتے تھے، جن کتابوں کے حصول کے لیے مامون جزیہ تک معاف کر دیتا تھا۔ صولت پبلک لائبریری دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اہل یورپ نے ہمارے اجداد کے کارناموں کو محفوظ کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھایا، نہیں تو ہوسکتا تھا کہ کتابوں کے قبرستان میں ان کی بھی ایک قبر بن جاتی۔ بقول علامہ اقبال:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی — ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی — نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

☆☆☆

Obaidurrahman
Research Scholar Dept. of Arabic,
BHU, Varanasi- 221005,
Mob. 9935773611
E-Mail: orqasmi@gmail.com

’نئے چہرے نئے افسانے‘ اور ’ادبستان‘

محمد ریحان اسراریؔ

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلابی تغیرات سے بہت ساری تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاغذ نے قلم سے دشمنی کر لی ہو۔ بچوں کی کلاس میں بلیک بورڈ کی جگہ پروجیکٹر (Projecter) ہاتھوں میں قلم کی جگہ کی بورڈ (Keyboard) پر دوڑتی انگلیاں، لفظ نئے مواصلاتی نظام میں ڈھل کر پرنٹ میڈیا سے آگے الیکٹرانک میڈیا کے دور میں پہنچ گئے۔ پرسنل کمپیوٹر اور موبائل کی دنیا میں کھویا ذہن کتابی مطالعے کے لطف و انبساط سے انجان، وہاٹس ایپ (Whatsapp)، فیس بک (Facebook)، ٹیوٹر (Twitter)، انسٹاگرام (Instagram) کے یوٹو پیائی نگار خانے میں گم ہے۔ الفاظ کے ڈیجیٹائزیشن (Digitization) کے درمیان سوشل میڈیا کے بطن سے دانش اثریؔ کا مرتبہ افسانوی مجموعہ ’نئے چہرے نئے افسانے‘ کا وجود میں آنا خوشی کا باعث ہے۔ وہاٹس ایپ یونیورسٹی کہی جانے والی دنیا میں ’ادبستان‘ (Whatsapp Group) کی انفرادیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس پر ہورہی تخلیقی سرگرمیاں زیب قرطاس ہوکر تنقیدی و تخلیقی کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

’نئے چہرے نئے افسانے‘ نئے لکھنے والوں کی قلندرانہ جرأت کا مظہر ہے۔ اس میں شامل نثری اصناف کی تعداد یوں ہے۔ افسانے ۱۲، مائکروفس ۴، افسانچے ۴، ناولٹ ۱، مختصر کہانی ۴، مزاحیہ مضمون ۱، آپ بیتی ۱، کہانی ۵، کل ملا کر ۳۲ تخلیقی نگارشات ہیں۔

’نئے چہرے نئے افسانے‘ کی تخلیقات اپنے عناوین کی فہرست کے علاوہ اپنے صنفی نام سے بھی معنون ہیں۔ اس میں داستان، ناول، افسانہ، افسانچہ کے بعد ایک نئی صنف مائکروف سے روشناسی ہوئی۔ جب کہ کہانی اور پوپ کہانی کی ژولیدگی برقرار ہے۔ اس نئی کہانی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک مختصر کہانی مائکروف کے لقب سے ملقب ہوگئی۔ بقول شخصے داستان افراط وقت کا نتیجہ تھی۔ زمانۂ قدیم میں لوگوں

کے پاس وقت بہت ہوتے تھے۔ وقت گزاری کے لیے کہانیاں سب سے اہم ذریعہ سمجھی جاتی تھیں۔ کہانی کی ہیئت بدلتے زمانے کے ساتھ تبدیل ہوتی رہی۔ داستان انیسویں صدی میں اپنے اختصار کے ساتھ ناول کے قالب میں ڈھل گئی۔ ناول کی مختصر شکل ناولٹ کہلائی۔ بعد از آں مشینی دور کے انقلاب میں عدیم الفرصت انسانوں نے کہانی کے مخصوص وقوعے کو افسانے کا نام دیا۔ اس کے فنی رمز کو وحدت تاثر کے نام سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ کہانی کے مذکورہ ناموں کی معقول علت موجود ہے۔ 'نئے چہرے نئے افسانے' میں شامل مائکروف کی علت کیا ہے؟ ایک سکینڈ کا دس لاکھواں حصہ ایک مائکروسکینڈ (Micro Second) کے برابر قرار پاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سکنڈ کے دس لاکھویں حصے کو مائکرو کہتے ہیں تو مائکروف کے طول و عرض کا پیمانہ کیا ہونا چاہیے؟ اگر 'نئے چہرے نئے افسانے' میں شامل تخلیق مائکروف ہے تو پچیس لفظی کہانی اور افسانچہ کو کس زمرے میں رکھا جائے؟ ایجاد سے کوئی نہیں روکتا۔ ہاں! وضاحت طلب امور پر گفتگو ہونی چاہیے، تاکہ نو واردانِ ادب کے لیے عناوین معمہ نہ بن جائیں۔ شاعری کی عمدہ ترین روایت اردو ادب میں موجود ہے۔ یہاں صنفی عناوین کی شناخت اپنی نظیر آپ ہے۔ جیسے مثنوی کا داستانوی انداز، مرثیے کی غمزدہ فضائیں، قصیدے کا شاہانہ جلال، غزل کی ریزہ خیالی، رباعی کے چوکھٹے اپنی فطری پہچان رکھتے ہیں۔ شعری روایت کی موجودگی نثری اصناف کے تعین میں مدد کی ضامن ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستعار صنف کو رگڑ گھس کر اردو ادب کے چوکھٹے میں فٹ کیا جائے۔

'نئے چہرے نئے افسانے' کی تنقیدی شق پہ گفتگو سے پہلے کلیم الدین احمد کا مشہورِ زمانہ جملہ یاد آتا ہے ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔'' کلیم الدین احمد نے یہ مشہورِ زمانہ جملہ ۱۹۴۲ء میں شائع شدہ کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں لکھا تھا۔ اس قول کے تناظر میں اگر تنقیدی ادب پر نظر ڈالی جائے تو سوائے شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، شمس الحق عثمانی، شمیم حنفی، ابو الکلام قاسمی، علی احمد فاطمی، صفدر امام قادری وغیرہ کے کہ تنقید جن کا اوڑھنا بچھونا ہے، سمیناروں میں پڑھے جانے والے تنقیدی مقالے، پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کو کھتونی ہی کہا جا سکتا ہے۔

اس برتے پر تو کلیم الدین احمد کے قول کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر بزرگ ناقدوں کا کارواں گزر گیا تو کیا اردو تنقید کا سفر ختم ہو جائے گا؟ ایسے میں اردو ادب کی نئی نسل کی تنقیدی صلاحیت کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری کون اٹھائے گا؟ اگر دیکھا جائے تو نئے دور کے تخلیق کاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی تخلیقات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہاں تنقید کی غیر جانبدارانہ روایت متاثر ہوتی نظر آ رہی ہے۔ یہ الگ بحث ہے، اس سے قطع نظر موجودہ سوالوں کے جواب میں نئی نسل کے چند نوجوانوں

نے بہت معمولی حدود میں رہ کر 'نئے چہرے نئے افسانے' کی تنقیدی شق میں نئی نسل کی شمولیت کو ٹوٹا پھوٹا ہی صحیح ایک چڑے کی قلندرانہ بے دماغی کا پہلا قدم تصور کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اراکین ادبستان، خصوصاً دانش اثری جن کی تحریری کاوشیں ہم عصروں کے عزم کو جولانیاں عطا کرتی ہیں، لائق ستائش ہیں۔

'نئے چہرے نئے افسانے' کا تخلیقی سرا مبین نذیر کا افسانہ 'متاع بے بہا' کے نام سے معنون سماج کے غلط رویوں کا ترجمان ہے۔ افسانے میں اس بات کی پیش کش کہ شوشل میڈیا کا غلط استعمال کتنا بھیانک ہو سکتا ہے۔ افسانے میں اسلوب کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ انگریزی کے ۱۵/الفاظ شامل ہیں جو نثر کو مکرر پرونے میں مصروف ہیں۔ افسانے کا پلاٹ سوشل میڈیا نئے دور کی بھول بھلیاں ہے۔ اس لیے نثر میں بلا روک ٹوک انگریزی لفظ داخل ہو گئے۔ لیکن فنکار نے کمال ہوشیاری کے ساتھ لفظی در وبست کی وہ لڑیاں پروئیں کہ نثر کا حسن متاثر نہ ہو سکا۔ اردو انگریزی سے بنی ترکیبیں شوخ سیلفیاں، شوخ کمنٹس اور اموشنز جیسے لفظ نثر کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ افسانے کا آخری جملہ انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے جو سوشل میڈیا کے خطرناک نتیجے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ویلنٹائن (Valentine) کے معنی معشوق کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ویلنٹائن ڈے (Valentine Day) ہونا چاہیے۔

''چند حسین ساعات کے عوض اس کی متاع بے بہا ویلن ٹائن (Valentine)
کی اجتماعیت کا شکار ہو چکی تھی۔''

'قصور' محمود انصاری کا افسانہ ہے۔ لڑکیوں کی شادی کا نہ ہونا ایک حساس موضوع ہے۔ سماج میں عورت ذات کے لیے اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شے کی حیثیت سے اس کی مول تول کی جائے۔ 'عورت' جس کے قدموں میں رسول (ص) نے جنت بتائی ہے، اس کی اس قدر ذلت موجب حیرت ہے۔ اس افسانے کی تنقیدی شق میں دانش اثری کا سوال یہ ہے کہ ''ہمارے سماج میں حسن کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟'' جواب بھی بقولِ دانش اثری ''اگر آپ تعدد کی اجازت نہیں دیں گے تو یہ مصیبتیں آپ کو جھیلنی ہوں گی۔'' مطلب؟ تعددِ ازواج پر بندش سے حسن اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ تو پھر ہمارے ہی سماج میں حسین بیوی ہونے کے باوجود دوسری شادی کی مثال کیوں موجود ہے؟ کچھ جوڑے تو ایسے بھی دیکھنے میں آئیں گے کہ بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ ارے......! یہی آپ کی پسند تھی۔ یہ باتیں صرف بیوی اور بہو پر موقوف نہیں آج کل تو لڑکی کی شکل میں سکریٹری، ائیر ہوسٹس، سیلز مین، ویٹر سے لے کر ٹیچر تک سب میں خوبصورتی کی تلاش رہتی ہے۔ ٹی وی پر چلتی فلموں کی یلغار نے معاشرے کا اسٹرکچر (Structure) ہی

بدل دیا ہے۔ ہیروئن جیسی خوبصورت بیوی کا تصور ہر شخص کے ذہن میں اپنا پیر پسارے ہوئے ہے۔ اس لیے تعددِ ازواج پر بندش سے حسن کی اہمیت کا کوئی لینا دینا نہیں۔

اسلام نے بھی حسن کو کہیں ترجیح نہیں دی ہے، خاص طور پر ازدواجی زندگی کے انتخاب میں دینداری کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہاں! تعددِ ازواج کی بدولت انسانی متلون مزاجی، فحاشی، ہوس پرستی جیسی لعنت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ جنسی تناسب (Sex Ratio) کے تناظر میں اسے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اعداد و شمار اور سائنسی حقائق بھی جواز میں پیش کیے جا سکتے تھے۔ بہر حال افسانہ نگار نے سماج کے حساس موضوع کو چھونے کی اچھی کوشش کی ہے۔ عہد جدید ایسے مسائل سے نبرد آزما ہے۔ نثر کی چستی، فنی چابک دستی کی مظہر ہے۔ مئو کے علاوہ مختلف شہروں سے شامل نثر نگاروں نے اپنی فکری جولانیوں کو خوب سے خوب تر نثر کا جامہ پہنایا۔ اس کے لیے رخسانہ نازنین (کرناٹک)، مجاہد سلیم (مالیگاؤں)، زارا فراز (جمشید پور)، طاہر انجم صدیقی (مالیگاؤں) نور محمد برکاتی (مالیگاؤں)، اصغر شمیم (کلکتہ)، عائزہ کوثر (جمشید پور، جھارکھنڈ)، اطہر کلیم انصاری (ناندیر مالیگاؤں) ام حبیبہ (جمشید پور) قابل مبارکباد ہیں۔ ہر ایک کے افسانے پر لکھنا مشکل بھی ہے۔ خوف طوالت اس کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ چوں کہ اس تخلیقی و تنقیدی گلدستے کے محور و مرکز، منظر و پس منظر میں مئو اور اہل مئو ہیں۔ مئو کے چند فنکاروں پر مختصر گفتگو اس لیے بھی ضروری ہے کہ 'ادبستانی' مقاصد کے نتیجوں کا حاصل معلوم ہو سکے۔

'چوتھی رت' شائزہ عقیق مئو کی عمدہ کاوش ہے۔ عورت جو کہ تخلیق انسانی کی منبع و ماویٰ ہے۔ ایام حمل میں عورتوں کو کس درد اور کرب سے گزرنا پڑتا ہے، ایک عورت ہی اس کو بہتر طور پر بیان کر سکتی ہے۔ موت کا خطرہ ہر آن برقرار، پھر بھی عورت پُر امید رہتی ہے۔ اس مشکل گھڑی میں عورت کا صبر و تحمل اس کی عظمت کی نشانی ہے۔ اسلوب نگارش مائل بہ پرواز ہے۔

'شہر ذات کا موسم' دانش اثری کا علامت سے بھرپور افسانہ ہے۔ لفظ و معنی کے در و بام اس شدت سے ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک خوبصورت نثری نگارخانہ کے قیام میں مصروف تھے اور میں حیران تھا کہ افسانہ ہے یا طلمستان، جہاں بننے بگڑنے کے عمل میں ایک نظم ہے۔ فن پارہ کے متعلق خود فنکار بھی حیران ہے کہ یہ علامتی افسانہ ہے یا علامتوں میں گوندھی ہوئی سوانح...... بہر حال افسانے کی تنقیدی شق میں نعیم بن سلیم نے اچھی تشریح کی ہے۔ افسانے کا ناصحانہ پہلو یہ ہے کہ کبھی ناامید نہ ہوں۔ ہر روز نئی امید کا دیا روشن کرتے ہوئے بہ تدریج منزل کی طرف گامزن رہیں۔ 'خود غرض' افسانے کا موضوع انتہائی سنجیدہ ہے۔ شاید نہال جالب نے اپنے اطراف و جوانب کے مشاہدے کو تحریری قالب میں ڈھالنے کی بہترین کوشش

کی ہے۔ موجودہ سماج، شہروں کی خیرہ کن روشنی، روپے کی ریل پیل کے درمیان رشتوں کی نزاکت کو بھول گیا ہے جو صحت انسانی کے لیے ناسور ہے۔ تخلیق کار نے سماج کے اِنھیں رویوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب کی سطح پر طول طویل جملے، جملوں کی بے ڈھب ساخت، اتنی سرعت کے ساتھ حال سے ماضی اور ماضی سے حال تک کا سفر قاری کے لیے الجھن کا باعث ہے۔

اب چوں کہ نئے چہرے ہیں تو لغزشیں ممکن ہیں۔ دو سطر لکھنے میں اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنی تحریریں بار بار پڑھیں۔ مشہور فکشن رائٹر رسکن بانڈ اپنے ناول کی اشاعت سے پہلے چار چار بار پڑھا کرتا تھا۔ اس سے تحریری مشقت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ عمران ساگر 'الجھی گرہوں' کے لیے لائق مبارکباد ہیں۔ 'حصار ذات کی چیخیں' ذاکر انور کا افسانہ ہے۔ فنکار نے اپنے جذبات کو اس شدت کے ساتھ افسانے کی بنت کا حصہ بنایا ہے کہ قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ جملے طوالت سے بوجھل ہیں۔ لفظی نشست و برخاست عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ ابو ہریرہ یوسفی کا مقالہ 'جدید ٹیکنالوجی اور اردو' میں مقالہ نگار نے معروضیت کے ساتھ اردو زبان اور تکنیک کی تفصیل پیش کی ہے۔ غرض یہ کہ مئو میں نئے لکھنے والوں کے لیے 'ادبستان' (Whatsapp Group) ایک بہترین پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے۔

کسی بھی تنظیم یا فکری منہج پر گفتگو سے پہلے اس کے عوامل و عواقب کی تلاش پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ ادارہ 'ادبستان' کی تخلیقی بساط کیا ہے؟ اس کے پس پردہ کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ اس ناچیے سے گفتگو، ہمیں اس تخلیقی سرگرمی کے گہوارے کا پتا دیتی ہے، تب کہیں جا کر مئو شہر ہنروراں کا راز کھلتا ہے۔ ۶۰ رکی دہائی میں اردو کے تئیں حکومت وقت کی معاندانہ روش محبان اردو کو لرزا گئی۔ چنانچہ شہر مئو میں 'بزم ادب' کی شعری نشستیں ادب کی بے لوث خدمت کرتی رہیں۔ بعد ازآں 'بزم ادب' کے باشعور جیالوں نے منور علی سیٹھ کی سرپرستی میں ۱۹۶۱ء میں دانشکدہ لائبریری مئو قائم کی۔ مئو کے گلیارے اردو ادب میں تاریخی مقام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۷۰ رکی دہائی تقریباً ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں ادبا و شعرا کی شمولیت مئو کے ادبی ذوق و شوق کا پتا دیتی ہے۔ بر سبیل تذکرہ ایک بزرگ سے ذکر اس جلسے کا کیا، خوشی دیدنی تھی۔ بتایا کہ خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانے پڑھے تھے جن کے عناوین میں '۷۰ رہزار بکریاں'، 'بقیہ سب خیریت ہے' یاد ہے۔ مذکور اس کا عوامی ذوق و شوق تھا۔ شہر میں شعر گوئی کے فروغ کے لیے ابتدا سے ہی انجمنیں قائم ہیں۔ بزم ادب، روحِ ادب، بزم اردو، بزم تعمیر اردو، اردو پڑھاؤ تحریک جیسی انجمنیں پابندی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ نشستوں میں شعرا کے علاوہ شائقین کی قابل ذکر تعداد کی موجودگی عمومی

ذوق وشوق کا پتا دیتی ہے۔اس کے علاوہ اردو ادب کے فروغ میں شہر کے مدارس کی خدمات قابل قدر ہیں۔
غرض یہ کہ مئو کی اپنی خود کی شناخت ہے۔ بزمی بنارسی، مولانا فیض الحسن، فضا ابن فیضی، اثر انصاری، حکیم عبدالرشید انجم، حبیب اللہ نیر اعظمی، وہمی رحمانی، ماہر عبدالحئی، دل حسینی، سردار شفیق، مشتاق شبنم، ڈاکٹر منور انجم، وکیل اشہر، غنی احمد غنی، بسمل انصاری، شفق انجمی، ناصر انصاری، تمنا انصاری، اچانک مئوی جیسے شعرا مئو کی ادبی اہمیت پر دال ہیں۔

شاعری کی اتنی عمدہ روایت کے برعکس نثر کا میدان خالی از امکان نظر آتا ہے۔نثر کی خال خال روایات کا ذکر ماضی کی ورق گردانی کے دوران ۱۹۴۶ء میں رسالہ 'غالب'، ایڈیٹر بشیر احمد اور تقریباً ۱۹۷۴ء میں رسالہ 'ہم چشم'، ایڈیٹر دل حسینی جیسے رسالے نثر کی بقا کے لیے میدان میں آئے۔ ۱۹۶۹ء میں چراغ اعظمی کا ہفتہ وار اخبار 'دیروز' ۱۹۸۴ء تک تسلسل کے ساتھ نکلا۔ کسی وجہ سے یہ اخبار بند کرنا پڑا اور نام بدل کر 'بنکر کی دنیا' کے نام سے شائع ہوا۔ آج بھی اپنی نثری چاشنی اور لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ اردو نوازی کی روشن مثال ہے۔ ایم۔ نسیم اعظمی کی ادارت میں شفق کا مشہور ناول 'کانچ کا بازی گر' ادب نکھار پبلی کیشن مئو سے تقریباً ۸۱-۱۹۸۰ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ شفق، ذوقی، غضنفر اور احمد صغیر کے افسانوں کو ماہنامہ 'ادب نکھار' نے شائع کیا۔ بعد از آں ادب نکھار پبلی کیشن تحلیل ہو کر عدیلہ پبلی کیشنز کے نام سے پہچانا گیا۔ اس کی نثری خدمات میں 'ادبی گزٹ' آج کل اپنے بدلے ہوئے نام 'تخلیق و تحقیق' ظہیر حسن ظہیر کی ادرات میں ادب کی میزان میں اپنا اعتبار قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ ایم۔ نسیم اعظمی کا شعری مجموعہ 'فیضان آگہی' منظر عام پر آکر مقبول خاص وعام ہو چکا ہے۔ اکرم اعظمی کے دو افسانوی مجموعے 'فاہیان کا بیٹا' اور 'دو سہیلیاں' نمایاں ہیں۔ مضمون میں شامل چند اطلاعات جن کی تحریری سند نہیں مل سکی، اس کی تصدیق چراغ اعظمی (پ: ۱۹۳۶ء)، ڈاکٹر شکیل احمد (پ: ۱۹۵۳ء)، کامریڈ جلیس (پ: ۱۹۵۴ء)، ایم۔ نسیم اعظمی (پ: ۱۹۵۸ء) نے کی ہے۔ مضمون میں سنین بزرگوں کی یادداشت کے حوالے سے تحریر کیے گئے ہیں۔ بہر حال ادھر چند سالوں کے اندر چراغ اعظمی کا افسانوی مجموعہ 'عذابِ دہر' اور ڈاکٹر شکیل احمد کی انشا پردازی کی روشن مثال 'اردو افسانوں میں سیاسی وسماجی مسائل'، 'مئو شہر ہنروراں'، 'نشاطِ قلم'، 'بادل چھاؤں' اور 'حسابِ جاں' اپنی تخلیقی و تحقیقی نگارشات کے آئینے میں اہمیت کے حامل ہیں۔ نثر کے نام پر تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی حیرت کا باعث ہیں۔ ایسے میں شہر کی تخلیقی نثر کا انجماد نئی نسل کو فکری تازیانے لگا رہا تھا۔

اس دوران چند نوجوانوں نے اپنی فکری بالیدگی کا ثبوت دیا اور شہر کے وسط مئو نگر پالیکا پریشد کے سمینار ہال میں 'ادبستان' نامی ادارے کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد شہر سے نثری انجماد کو ختم کرنا، نئی نسل کو

افسانہ نگاری نیز تنقید نگاری کے میدان میں لانا ہے۔ یہ نئی بات نہیں تھی۔ ماضی میں 'انجمن ترقی اردو مئو' جس کے صدر دوجندر ناتھ پانڈے اور سیکریٹری ایم۔ نسیم اعظمی ہوئے۔ حال میں 'حلقۂ ادب وثقافت' نامی ادارے نے کوشش کی تھی۔ لیکن اراکین ادارہ کی تعلیمی مصروفیات کے باعث عمل آوری ممکن نہ ہوسکی۔ اراکین 'ادبستان' نے اپنی منزل کے پہلے پائدان پر قدم رکھتے ہی 'نئے چہرے نئے افسانے' جیسا تخلیقی وتحقیقی تحفہ شہر مئو کے حوالے کیا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بدولت اطلاع رسانی (Communication) بہتر ہوئی اور کسی بھی ادارے کی بہتر کارکردگی کا انحصار اراکین کے آپسی رابطے پر محیط ہے۔ شہر کے نثری فقدان کے خاتمے کو اٹھایا گیا۔ یہ قدم ہندوستان کے مختلف حصوں سے نثر نگاروں کو جمع کرنے کا باعث ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دانش اثری کی انگلیوں پر شمار کیے گئے ۶-۷ نثر نگاروں کی موجودگی اس کتاب میں بھی ہے۔ جب کہ 'نئے چہرے نئے افسانے' کی تخلیقی پیش کش میں ۲۵ / فنکار شامل ہیں۔ یہ خوش آئند قدم ہے۔ امید قوی ہے 'ادبستان' کا یہ قدم اہل مئو کی تخلیقیت کے لیے روشن مستقبل کا ضامن ہوگا۔ امید کرتا ہوں شہر مئو کی یہ ادبی کہکشاں اپنی نظیر آپ بنے گی۔

☆☆☆

Md. Raihan Asrari
Research Scholar Dept. of Arabic,
Persian, Urdu & Islamic Studies,
Visva-Bharati Santiniketan-731235,
Mob. 8090735284,
E-Mail: raihanasari53@yahoo.com

علی سردار جعفری: سیاست کے مد و جزر میں تیرتا سخنور

محمد سرور لون

اردو میں جن ترقی پسند شعرا نے سب سے زیادہ سیاسی موضوعات کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا ان میں علی سردار جعفری کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ چونکہ ان کا تعلق اس دور سے تھا جس وقت اردو شعر و ادب میں اہم ترین موضوع سیاست تھا جس کے نتیجے میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بظاہر برصغیر کی تقسیم سیاسی اتفاق رائے سے ہی ہوئی تھی اور پورا برصغیر سیاسی بحران کا شکار تھا، سیاست کا لفظ بھی اسی بحران کا شکار رہا۔

یوں تو سردار جعفری کوئی سیاسی لیڈر یا رہنما نہیں تھے۔ وہ تخلیقی، تحریکی اور جمالیاتی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مارکسی نظریات سے پوری طرح متاثر تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ ممبر بھی تھے۔ اس کے علاوہ ادبی، ثقافتی اور تحریکی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں چاہے وہ علی گڑھ میں ہو یا لکھنو، علی سردار جعفری نے سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ علی گڑھ سے ان کا اخراج بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لکھنو میں انھوں نے اسٹوڈینٹ یونین کا الیکشن بھی لڑا اور جیتا بھی۔ اس وقت وہ کمیونسٹ پارٹی کی اسٹوڈینٹ ونگ، اسٹوڈینٹ فیڈریشن آف انڈیا کے ممبر تھے اور اسی کے ٹکٹ پر انھوں نے اسٹوڈینٹ یونین کا الیکشن لڑا تھا۔ علی سردار جعفری نے اپنی جیت درج کر کے پہلی مرتبہ زمیندار و تعلقہ دار لابی کو لکھنو یونیورسٹی یونین سے باہر کر دیا تھا اور پھر سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ بقول سجاد ظہیر:

> ''علی سردار جعفری جو علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر نکالے جانے کے بعد اب لکھنو یونیورسٹی میں ایم۔اے کرنے کے لیے داخل ہو گئے تھے لیکن اپنا بیشتر وقت اسٹوڈینٹس فیڈریشن اور ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو دیتے

> تھے۔'' (روشنائی، ص ۲۴۶)

سردار جعفری کو جب علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالا گیا تو وہ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہو گئے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے قلم کاروں کا مطالعہ کیا بالخصوص لینن، گاندھی جی، نہرو وغیرہ کی سوانح عمریاں پڑھیں اور اس طرح اشتراکی کتابوں کے مطالعے اور منٹو، مجاز وغیرہ کی صحبت نے انھیں اشتراکی تحریک کی راہ پر ڈال دیا اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کی زندگی کا مقصد شاید مل گیا ہے۔ اس طرح وہ مارکسی نظریات کے حامی ہو گئے اور اس دور میں جس طرح کی شاعری کی، اس میں مارکسی نظریات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مجاز، رشید جہاں، سجاد ظہیر، سبط حسین وغیرہ سے قربت نے ان کے اس نظریے کو مزید پختگی عطا کر دی۔ اس کی فکر کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ یہاں سے وہ کسی قیمت پر پیچھے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ جس کے نتیجے میں انھیں دوبار جیل بھی جانا پڑا۔ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی کے دوسرے خطبے میں سردار جعفری کہتے ہیں:

> ''میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں جب میں نے لکھنو یونیورسٹی کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے طلبا کو سر ماریس گورنر کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے آمادہ کیا اور ہندوستان کے یہ چیف جسٹس لکھنو میں کانوکیشن کا خطبہ نہیں پڑھ سکے تو یوپی کے گورنر نے وائس چانسلر کو یہ ہدایت دی کہ مجھے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن وائس چانسلر نے برطانوی حکومت کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وائس چانسلر حبیب اللہ صاحب تھے اور میرے استاد انگریزی کے پروفیسر سدھانت، دونوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ آخر کار حکومت نے مجھے گرفتار کر کے ایم۔اے فائنل کا امتحان دینے سے روک دیا۔'' (ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، ص ۶۰)

یہ ان کی زندگی کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ رہا۔ جیل سے آٹھ ماہ بعد رہائی عمل میں آئی۔ اس کے بعد بلرام پور میں نظر بند رہے۔

۱۹۴۰ء میں سردار جعفری کی ملاقات مخدوم محی الدین سے ہوئی۔ اس سے پہلے مخدوم سے 'نیا ادب' کے سلسلے میں خط و کتابت ہو چکی تھی۔ سردار جعفری لکھنو میں تھے اور مخدوم حیدرآباد میں۔ جیل میں رہنے کی وجہ سے انھیں اس وقت مخدوم سے زیادہ تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں مل سکا۔ پھر جب وہ ۱۹۴۱ء میں مخدوم سے ملے تو یہاں انھیں تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اس بارے میں سردار جعفری 'مخدوم سرخ سویرے کا شاعر' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ تصویر ہماری اس وقت کی جذباتی کیفیات کی ترجمان تھی۔ ہمارا پورا 'نیا گروپ'

اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ہم نے اسی زمانے میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ
نظمیں اورنوجوان انگریزی ادیب کاڈویل ریلف فاکس اور جانکرافوارڈ کے حالات پڑھے
تھے۔ ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت،
شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑ کر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں۔'' (مخدوم: سرخ
سویرے کا شاعر، سردار جعفری، ص ۳، نوائے ادب، جنوری-مارچ ۲۰۰۴ء)

۱۹۴۱ء میں سردار جعفری کی عالمی فکر کی یہ بہترین تصویر کشی ملتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی
کے جنرل سکریٹری جناب پی ہوش سی جوشی اور سجاد ظہیر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ممبئی کے
ایک کمیونسٹ اخبار کے لیے استعمال میں لائیں۔اس وقت سجاد ظہیر اور سردار جعفری دونوں نے اخبار کی ذمہ
داری سنبھال لی۔اس اخبار نے سردار جعفری کے سیاسی شعور کو مزید جلا بخشی۔سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اس اخبار کی اشاعت نے میری صلاحیتوں کو جلا بخشی اور کمیونسٹ پارٹی نے
مجھے باقاعدہ طور پر اپنا کارڈ ہولڈر بنا لیا۔جس کی میں نے ۵۸ رکے بعد کوئی تجویز نہیں
چاہی۔لیکن میں مارکسسٹ رہا۔اس پارٹی سے منسلک رہ کر مجھے سمترا انندن پنت، جوش
ملیح آبادی اور دوسرے کئی دانشوروں سے ملنے کے مواقع ملے۔کئی فلمی ستارے بھی
ہمارے دفتر میں آتے تھے۔خصوصاً کے ایل سہگل، پرتھوی راج کپور، کے این سنگھ یہ
سب میرے بے حد چاہنے والے تھے۔'' (لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں، ص ۶۰،
کتاب نما، علی سردار جعفری نمبر، نومبر ۱۹۹۰ء)

اوپر ذکر کیے گئے واقعات سے سردار جعفری کی بصیرت اور سیاسی نظریات کی کماحقہٗ وضاحت
ہوجاتی ہے۔اصل میں سردار جعفری نظم نگار شاعر تھے۔وہ اپنی زندگی میں شروع سے آخر تک ترقی پسند
تحریک سے متاثر رہے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا سوال ہے یہ ایک ادبی تحریک ضرور ہے، لیکن ساتھ
ہی ایک سیاسی نظریے کی علم بردار بھی ہے۔اس تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں اس
سیاسی نظریے کے حلقے اور گہرے رنگ صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک سے
وابستہ شعرا کا سوال ہے، توفیض، مخدوم، ساحر اور مجروح کے مقابلے میں سردار جعفری کے یہاں سیاسی رنگ
زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔خاص طور پر ان کی نظموں میں سیاسی فکر زیادہ نمایاں ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے:

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی

نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

سردار جعفری ایسے واحد شاعر ہیں جنھوں نے عظیم اکتوبر انقلاب، اس کے رہنما لینن اور سوویت
اشتراکی سماج پر سب سے زیادہ نظمیں کہیں ہیں۔انھوں نے انقلابیوں کی ستائش، سرخ سپاہیوں کی حوصلہ
افزائی اور راہ انقلاب میں جاں بحق ہونے والے سپاہیوں کو خراج عقیدت اور تحسین کے لیے شاہکار نظموں
کی زبان دی ہے۔

ہندوستان میں جب آزادی کی تحریک زور وشور پر تھی تو انگریزی حکومت آزادی کی اس تحریک کو
دبانے کے لیے تمام ناجائز حربے استعمال کر رہی تھی جن میں تحریر وتقریر پر پابندی سے لے کر 'رولٹ
ایکٹ' تک شامل تھا جس کے مطابق کسی بھی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے مہینوں قید میں رکھا جا سکتا تھا۔اس کی
سخت مخالفت ہوئی لیکن حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ انگریزوں نے ہر احتجاج کو سختی کے ساتھ کچلنے کی
روش اختیار کی۔ یہاں تک کہ جلیاں والا باغ جیسا واقعہ پیش آیا جہاں انگریزوں کی بربریت اور سفاکی انتہا
پر نظر آتی تھی۔ان حالات میں سردار نے بھی بڑی شدت کے ساتھ انگریزی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام
کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار شروع کیا، یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے سردار جعفری کی نظموں میں سیاسی
عنصر نظر آتا ہے۔اُن کے پہلے شعری مجموعہ 'پرواز' میں 'مزدور لڑکیاں'، 'سرمایہ دار لڑکیاں'، 'اشتراکی'، 'ارتقاو
انقلاب'، 'جنگ اور انقلاب'، 'سامراجی لڑائی'، 'انقلاب روس' اور 'تعمیر نو' جیسے عنوانات پر نظمیں ملتی ہیں۔
سردار جعفری کی سیاسی نظموں میں اکثر وبیشتر ہم کو ایک انقلابی جوش اور شدت پسندی کا احساس ہوتا ہے۔
ان کا خیال ہے کہ فرسودہ نظام کو بدلنے کے لیے اگر تشدد کی ضرورت ہو تو اس کا سہارا لینا چاہیے۔ یہاں سردار
جعفری کی کچھ ایسی نظموں کے ایک دو بند پیش ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے سیاسی شعور کا اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔ان کی نظم 'بغاوت' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانونِ سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بددعاؤں سے
بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے

جنوری ۱۹۴۶ء میں گوالیار میں حکومت کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔انگریزی سرکار کے

حکم پر کچھ دیسی افسروں نے جلوس پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس میں ایک کم سن لڑکا شہید ہو گیا تھا۔ اس واقعے پر سردار جعفری نے ایک نظم 'گوالیار' کے عنوان سے لکھی۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

یہ دیسی حکمراں جو نسل انسانی سے خارج ہیں
وہ کہتے ہیں جنھیں انگریز آقاؤں نے پالا ہے
بھیانک ان کی روحیں ہیں تو مردہ ہے ضمیر ان کا
سفید ان کی رگوں کا خون ہے دل ان کا کالا ہے
کروڑوں مفلسوں کا خون جلتا ہے چراغوں میں
جو ان منحوس رجواڑوں کے محلوں کا اجالا ہے
یہ سب بے آسرا مظلوم بیواؤں کے آنسو ہیں
چمکتے موتیوں کی ان کی گردن میں جو مالا ہے
یہ سب برطانیہ کے تاج شاہی کے نگینے ہیں
ہر اک ان میں سے بھارت ورش کے سینے کا چھالا ہے

غرض سردار جعفری کی کچھ ایسی سیاسی نظمیں بھی ہیں، جہاں ان لہجہ تیکھا اور تیز و تند ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ سیاست دانوں کا وہ مکر وفریب ہے جو عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے ان کے لیے نئے مسائل کھڑے کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ سیاست داں ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ عوام اس بات سے بے خبر ہی رہیں کہ اقتدار و اختیار کو اپنے بس میں کرنے کے بعد سیاست داں کیسی کیسی گھناونی سازشوں اور بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔ اس کے لیے وہ عوام کو مذہب، ذات پات، علاقہ، زبان اور ایسے ہی کئی مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ایسے ملک دشمنوں اور قوم فروشوں سے نرم و ملائم زبان اور دھیمے لہجے میں بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ خود سردار کے الفاظ میں تشدد کا جواب تشدد ہی سے دیا جانا چاہیے اور تلواروں کو تلواروں ہی سے کاٹنا پڑتا ہے۔ اسی لیے سردار جعفری کی ان سیاسی نظموں میں ہم کو زبان اور لہجے کی تیزی و تندی کا احساس ہوتا ہے۔

سردار جعفری کا شعری مجموعہ 'امن کا ستارہ' ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا جس میں ان کی تین نظمیں 'سویت یونین اور جنگ باز'، 'استالن کتھا' اور 'امن کا ستارہ' شامل ہیں۔ سردار جعفری نے اس مجموعے کا انتساب ہی 'امن عالم کے مجاہدوں' کے نام کیا ہے جس سے ابتدا ہی میں واضح ہو جاتا ہے کہ ان نظموں کا مقصد سماج سے ظلم و بربریت اور استحصال و استبداد کو ختم کرنا اور امن و امان کی راہوں کو استوار کرنا ہے۔ اس

مجموعے میں سردار جعفری نے پیش لفظ سے پہلے ایک مختصر نظم بھی شامل کی ہے جو یوں ہے:

جنگ باز خوں خوارو!
ہم تمھیں سزا دیں گے
یہ غرورِ زرداری
خاک میں ملا دیں گے
خون کے پیاسے ہو
ہم مزا چکھا دیں گے
وہ نظام وہ دنیا جس میں جنگ پلتی ہے
ایک دن مٹا دیں گے

اس سماج میں سامراجی استحصالی قوتوں کا لوہا منوا لینے اور ان پر شاندار فتح پانے کا عزم اور امید دکھائی دیتی ہے۔ ایسی فتح یابی کے حصول سے شاعر کا مقصد ظالم و جابر نظام حکومت کا سدِ باب اور جنگ وجدل کا خاتمہ ہے تاکہ امن و آشتی کے نئے دور کا آغاز ہو سکے۔

مجموعے میں شامل تینوں نظموں میں رجائیت کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے جو عوامی بیداری کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا سے ظلم و جبر، خون ریزی و بدامنی اور غربت و افلاس مٹا دینے کے گراں قدر پیغامات کی حامل ہیں۔ یہ سویت یونین کو آئیڈیل مان کر دیگر ممالک بشمول ہندوستان میں ایسی خوشگوار صورتحال پیدا کرنے کی امنگیں اور آرزوئیں پیش کرتی ہیں جہاں عوامی حکومت کے زیر سایہ آزادی، ترقی اور امن و آشتی کا ماحول پروان چڑھے اور پھولے پھلے۔ لہٰذا 'سویت یونین اور جنگ باز' کا خاتمہ اس بند پر کرتے ہیں:

ہے ایک سوویت کا دیس خاک پر بسا ہوا
مگر اک اور ہے ہمارے خون میں رچا ہوا
ہماری آرزو ہمارے خواب میں سجا ہوا
یہ خواب وہ ہے جس کا کل زمیں کو انتظار ہے

سردار جعفری انقلاب اور بغاوت کو اپنا آلۂ کار تو بناتے ہیں لیکن ان کا مقصد کبھی بھی بے جا جنگ وجدال اور سفاکی و خوں ریزی نہیں بلکہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام کی تشکیل نو ہے تاکہ محکوم و مجبور عوام کو آزادی، انصاف، حق و مساوات مل سکے اور پرامن معاشرے کا قیام عمل میں آ سکے۔

ہندوستان کو جب آزادی حاصل ہوئی تو دیگر لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح سردار جعفری کے لیے بھی یہ نہایت ہی مسرت وانبساط کا دن تھا۔ وہ آزاد ہندوستان کو اپنے سپنوں کے آئینوں سے دیکھنا چاہتے تھے جو ایک مکمل اور آئیڈیل ملک بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ انھوں نے 'جمہوریہ کا اعلان نامہ' لکھا اور اس عزم کا اظہار کیا:

نہ پھر خوف ہوگا نہ پھر احتجاج   نئے سر سے تعمیر ہوگا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی   کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار   مصیبت سے چھوٹ جائیں گے کامگار
نئی دیں گے ماتھے کو تنویر ہم   بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

مگر وہ آزادی کے بعد ہندوستان کی صورتحال سے کبھی مطمئن نہیں رہے کیوں کہ یہ ہندوستان ان کی خواہشوں پر پورا اترتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ آزادی کے ساتھ تقسیم کی ہولناکی بھی آئی تھی جس نے نہ صرف لاشوں کے انبار پر ملک کے دو ٹکڑے کر دیے بلکہ مذہب کے نام پر ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ اس صورتحال میں بھی سردار جعفری نے امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ ملک کے اندرونی ماحول کو بہتر بنانے اور امن اور بھائی چارگی کو فروغ دینے میں مصروفِ عمل رہے۔ سردار جعفری نے اپنی عملی اور قلمی کوششوں کے ذریعہ ہندوستان کے اندر دو قوموں کے درمیان امن اور بھائی چارگی کے ماحول کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے دو تہذیبوں اور دو اہم زبانوں کو قریب لانے کی بھی کامیاب کوششیں کیں۔ انھوں نے دیوان میر اور دیوان غالب کی تدوین دیوناگری رسم الخط میں کی۔ انھوں نے سات جلدوں میں اردو غزلوں کا انتخاب 'غزل نامہ' ڈاکٹر راج نگم کے اشتراک سے ہندی میں شائع کیا۔

انھوں نے تقسیم ہند کے بعد ہندو پاک کے درمیان در آئی عداوت ومنافرت کی فضا ختم کرنے اور دوستانہ ماحول کو فروغ دینے کی کوشش کی جس کے اعتراف میں امریکہ کے ہاروڈ فاؤنڈیشن نے انھیں ۱۹۹۹ء میں خصوصی اعزاز سے نوازا۔ مساعی امن کے سلسلے میں ان کی نظم 'صبح فردا' کا ذکر برمحل ہوگا:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہوکے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہمارے خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

لاکھوں لوگوں کی طرح سردار جعفری کا بھی گراں قدر خیال یہ تھا کہ جنگیں صرف مسائل پیدا کر سکتی ہیں، مسائل کو حل نہیں کر سکتیں۔ ہند و پاک اگر چہ دو خطوں میں منقسم ہو چکے ہیں مگر دونوں ملکوں کے مسائل ایک ہی نوعیت کے ہیں لہٰذا دونوں ممالک کی حکومتوں کو جنگ کی تیاریوں میں بے جا مصارف ووسائل کی بربادی کی جگہ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ترقی کے لیے مصروفِ عمل ہونا چاہیے کیونکہ اسی میں دونوں کی بھلائی ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ء میں بھوپال گیس حادثہ ہوا۔ اس حادثے نے پوری انسانیت کو شدید صدمہ پہنچایا۔ اس واقعے سے متاثر ہوکر سردار جعفری نے ایک دل سوز نظم 'عنوان شہر یاراں' کے نام سے لکھی۔ اسی طرح بابری مسجد کی شہادت پر بھی کربناک نظم لکھ کر احتجاج کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ مئی ۱۹۹۰ء میں جب بھارت نے نیوکلر بم کا دھماکہ کیا تو سردار جعفری نے کھلے عام اس سے ناراضگی جتائی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ آج جب کہ بھارت کے سامنے لاتعداد مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست انسانی زندگی سے ہے، سب سے پہلے ان کا تدارک ضروری ہے نہ کہ نیوکلیر بموں کا دھماکہ، سردار جعفری کا پیغام امن کا پیغام ہے جنگ و جدال کا نہیں۔ وہ اس پیغام کی توسیع میں ملکی حدود کے منکر ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سردار جعفری کی شخصیت صرف شاعری تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ ہندوستان کی سیاسی صورتحال اور سماجی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی امور پر بھی رائے زنی ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

☆☆☆

Mohd. Sarwar Lone
Research Scholar Dept. of Urdu,
HCU Hyd-46, Mob.7006880370
E-Mail: lonesarwar1@gmail.com

الطاف احمد اعظمی کی نثری خدمات

فخرالاسلام

الطاف احمد اعظمی اعظم گڑھ کے گاؤں بھٹنی پارہ میں ۲/جولائی ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اسی دیار کی مشہور درس گاہ 'مدرستہ الاصلاح' سے پائی۔اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس کیا۔بعد ازآں ان کو جامعہ ہمدرد دہلی سے یونانی میڈیسن میں خدمات کے پیش نظر پی ایچ۔ڈی کی اعزازی سند سے نوازا گیا۔

اعظم گڑھ اتر پردیش کا ایک معروف علاقہ ہے۔علم و ادب کے حوالے سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری علمی و ادبی دنیا میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔یہاں پر علما، ادبا و شعرا کا ایک لا متناہی سلسلہ رہا ہے۔اس سر زمین سے شمس العلما کا خطاب پانے والے علامہ شبلی نعمانی ،عربی زبان کے ماہر علامہ حمیدالدین فراہی اور مفسر قرآن امین احسن اصلاحی نے اعظم گڑھ کا نام عالمی پیمانے پر روشن کیا۔یہاں پر علامہ اقبال سہیل اور کیفی اعظمی جیسے عالمی شہرت یافتہ شعرا پیدا ہوئے۔اسی سر زمین کے علمی سمندر کے ایک گوہر نایاب ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کی شخصیت بھی علم و ادب کے میدان میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جامعۂ ہمدرد میں ہی بحیثیت لکچرر سینٹر فار ہسٹری اینڈ سائنس کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔۱۹۸۶ء سے ۲۰۰۴ء تک صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔اسلامیات میں دلچسپی کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے ہمدرد یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز اور سوشل سائنس فیکلٹی کے ڈین بھی بنائے گئے۔۲۰۰۴ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ۲۰۰۵ء میں کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالہ) قائم چیر برائے اسلامک اسٹڈیز و تحقیق میں استاذ بھی رہے۔اس کے بعد کچھ مدت تک اردو اکادمی نئی دہلی کے وائس چیر مین بھی رہے۔

الطاف احمد اعظمی ان تمام مصروفیات کے باوجود اسلامیات سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔درس و تدریس

جیسی مشکل ترین مصروفیت کے ساتھ ساتھ مسند تحقیق و تصنیف کے منصب پر فائز رہے۔ان کی تحریریں رہروانِ علم کے لیے علمی ضیا پاشیوں کے بحر میں شناوری کا موقع فراہم کرتی رہتی ہیں۔اسلام، تاریخِ اسلام اور اسلامی علوم کے علاوہ مشرقی عبقریوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ان کا طریقہ اور ان کا رویہ عہد وسطی اور اس کے بعد کے عالموں کا ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ اساطیر مذہب و روایات اور عہد وسطی کے نصابی علوم کے پس منظر میں ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔بقول پروفیسر شمیم حنفی:

''الطاف احمد اعظمی صاحب بنیادی طور پر ایک علمی آدمی ہیں۔اس لیے ان کے ادبی مضامین میں بھی ایک عالمانہ شان ملتی ہے۔وہ اپنی بات نہایت سنجیدہ اور معروضی انداز میں دلائل کے ساتھ کہتے ہیں۔جذبات کی رو میں کبھی نہیں بہتے۔دانشوروں کی وہ روایات جو انیسویں صدی کے اواخر میں سر سید اور ان کے رفیقوں کے توسط سے مرتب ہوئی، الطاف صاحب کی دلچسپی کا خاص میدان ہے۔''(۱)

الطاف احمد اعظمی کی تحریریں زیادہ تر برِّ اعظم کے مسلمانوں بالخصوص ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے معاملات اور دینی مسائل کا محور و مرکز ہیں۔مسلمانوں کے اندر غلط مروجہ رسموں اور ان میں پھیلی بدعقیدگی جو مختلف فقہی دبستانوں اور مسلک کی وجہ سے ان کے خون میں سرایت کر گئی ہیں اور ہر مسلک اور فرقے کے علما اپنے نظریے کو صحیح ثابت کرنے اور دوسرے فرقوں کو باطل قرار دینے میں قرآن و حدیث کو اپنے فقہی تناظر سے معنیٰ و مفہوم توڑ مروڑ کر بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔بھلے ہی ان کو اس کے لیے کتنا ہی ظلم کرنا پڑے۔الطاف احمد اعظمی نے ان مسائل اور ان کا حل تلاشنے کے لیے قرآن اور حدیث کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ان کی کتاب 'ایمان و عمل کا قرآنی تصور' میں مسلمانوں میں مروجہ غلط رسموں کو قرآن کی روشنی میں رد کیا گیا ہے، جس کے تحت ان کے اور علمائے وقت کے درمیان خاصے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔اس بنیادی اختلافات کو سمجھنے کے لیے میں انھیں کی تحریر مستعار لوں گا:

''مسلمانوں میں آپسی اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہ چار فقہیں ہیں جو آج سے ہزار برس پہلے اس دور کے حالات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی گئی تھیں۔مگر عصر جدید اور آج کے حالات میں ان کا ایک بڑا حصہ نا قابل عمل بن گیا ہے۔یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ فقہا کے فقہی استدلالات کے جس مجموعہ کو اسلامی شریعت کہا جاتا ہے اس میں ایسے بہت سے قیاسی احکام موجود ہیں جن کی اصل کا کچھ پتا نہیں یعنی یہ نہیں معلوم کہ وہ قرآن و سنت کی کن نصوص پر مبنی ہیں۔ان نقائص کے باوجود ہر فقہ کے ماننے

والوں کا اصرار ہے کہ انھیں کی فقہ اصل اور اسلامی شریعت ہے اور وہ نا قابلِ تغیر ہے۔ غیر مقلدوں کا خیال ہے کہ اسلامی شریعت وہ ہے جو روایات کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ احادیث میں معاملات سے متعلق جو جزئی احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں اس عہد کے سماجی اور تمدنی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس لیے وہ بھی نا قابلِ تغیر نہیں ہیں۔''(۲)

علاوہ ازیں الطاف احمد اعظمی نے علمائے دیو بند اور بریلویت کے علما کے عقائد کا موازنہ کیا ہے کہ کیسے علمائے دیو بند اور ان کے عقیدت مندوں نے اپنی تحریروں میں عقیدت اور تصوف کے نام پر شرک اور بدعات کو ہوا دی ہے۔وہ لکھتے ہیں: ''اشرف علی تھانوی کے ارادتمندوں نے صاف لفظوں میں ان کو غیب داں لکھا ہے۔ان عقیدت کیشوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے۔معلوم ہے کہ یہ عقل وخرد کے پرستار اور دین اسلام سے بیزار، دہریہ متشکک تھے۔ یہ فکر کی ایک انتہا تھی اور جب اس سے تائب ہوئے تو ایک دوسری انتہا پر جا پہنچے یعنی 'شیخ پرستی'۔''

بہر صورت، مذکورہ بالا باتوں سے قطع نظر الطاف احمد نے بحیثیت تنقید نگار ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے ادیب اور مصنفوں کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی اور مولانا وحیدالدین خان قابلِ ذکر ہیں۔جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے انانیتی پہلو کے حوالے سے ناقدین کی مختلف آرا ہیں۔ہم یہاں مولانا آزاد کی تحریروں سے متعلق الطاف احمد اعظمی کا خیال پیش کرتے ہیں:

''مولانا آزاد کی اس انانیت سے ان کی تفسیر 'ترجمان القرآن' بھی محفوظ نہیں ہے۔قرآن مجید وہ بارگاہ علم وخبر ہے جہاں ہر دور کے اساطینِ علم وفن نے جن میں عربی زبان کے مایۂ ناز ادیب، یگانۂ عصر عالم اور انشا پرداز شامل ہیں، اعتراف کیا ہے یہ علم و آگہی کا وہ بحرِ بے کراں ہے جس کے سارے موتیوں کا چننا کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بڑے بڑے غواصانِ علم اس کی تہ میں اترے لیکن جب سطح پر آئے تو تسلیم کیا کہ اس کے طول وعمق کی پیمائش ممکن نہیں ہے۔''(۳)

الطاف احمد اعظمی کسی بھی مسئلے پر دوٹوک رائے رکھتے ہیں۔ان کے تنقیدی شذرات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ان سب سے قطع نظر مولانا مودودی کے نظریۂ جہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ مولانا کا غیر قرآنی نظریہ ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ جہاد اور قتال قرآن حکیم کی دو جداگانہ اصطلاحیں ہیں۔جہاد کے لغوی معنی کمال درجہ کی سعی کے ہیں۔اس سعی کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی یہ سعی زبان سے ہوتی ہے، کبھی مال اور کبھی دعوت الی الحق کی پاداش میں مشکلات و مصائب کے جھیلنے سے، کبھی نفس امارہ کے خلاف لڑنے اور کبھی......اور یہ سعی کا انتہائی درجہ ہے......اللہ کی راہ میں جان دینے سے۔''(۴)

الطاف احمد اعظمی تدریس کے علاوہ اسلامیات کے میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔علامہ اقبال نے کہا تھا: ع۔'قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف' لیکن ایسے دور میں جہاں قوتِ فکر وعمل کا فقدان ہے، الطاف احمد اعظمی کی فکر مسند شریعت پر متمکن ہو کر ملت کی خوابیدہ روح کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ان کی کتابیں 'ہندوستانی مسلمانوں کا زوال'، 'احیائے ملت اور دینی جماعتیں'، 'وحدت الوجود ایک غیر اسلامی نظریہ'، 'اسلامی ریاست'، 'اسلام کا تصور جنگ'، 'ایمان وعمل کا قرآنی تصور'، 'جمہوریت اور اسلام'، اور 'حقیقتِ حج' وغیرہ ان کی بے چین روح کی غماز ہیں اور رہروان علم شریعت کے صحرا نوردوں کے لیے نخلستان کا کام دیتی ہیں۔

حوالہ جات:

۱-سخن ہائے گفتنی، الطاف احمد اعظمی، البلاغ پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، سرِ ورق
۲-اسلامی ریاست، الطاف احمد اعظمی، الحسنات، ۲۰۱۶ء، صفحہ ۱۲
۳-مولانا ابوالکلام آزاد، الطاف احمد اعظمی، الحسنات، ۲۰۱۵ء، صفحہ ۸
۴-احیائے ملت اور دینی جماعتیں، الطاف احمد اعظمی، ادارۂ تحقیقات واشاعت علوم قرآن، سنہ ندارد، صفحہ ۱۳۸

☆☆☆

FAKHRUL ISLAM
Research Scholar (urdu),
Depat. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,
Visva Bharati University Santiniketan (W.B.)
E-Mail: fkhrulislam89@gmail.com

پروفیسر نذیر احمد بحیثیت محقق ومدون

محمد عامر خان

پروفیسر نذیر احمد (۱۹۱۵ - ۲۰۰۸ء) اردو اور فارسی کے نامور محقق، مستند عالم، دانشور اور استاد کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری فارسی دنیا میں متعارف اور بجاطور پر قابل احترام ومعتبر شخصیت کے مالک ہیں۔ علمی وادبی تحقیق کا معاملہ ہو یا تدوین متن کا مسئلہ، دونوں میدانوں میں ان کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ تحقیق وتدوین کے میدان میں انھوں نے جو معیاری کام انجام دیے ہیں اس کی توقع ایک علمی اکادمی ہی سے کی جاسکتی ہے۔ آپ کے مختلف النوع علمی کارناموں کی روشنی میں تحقیق، تنقید، تدوین متن اور نسخہ شناسی وغیرہ کے اصول مرتب کیے جاسکتے ہیں۔

نذیر احمد ۳/جنوری ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش کے ضلع گونڈہ، پوسٹ آفس بنگواں کے ایک غیر معروف گاؤں کولھی غریب میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی محمد اسماعیل تھا اور والدہ حجن پھلیلا خالہ کہلاتی تھیں۔(۱) اس گاؤں میں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا، اس لیے آپ نے اپنے گاؤں کی عیدگاہ کے مدرسے سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد بنگواں کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ ذہانت رنگ لائی اور آپ مختلف امتحانات میں نمایاں کامیابیوں کی وجہ سے وظیفے کے حقدار قرار پاتے رہے۔ اس کے بعد گونڈہ میں گورنمنٹ اسکول میں ساتویں جماعت میں داخلہ لیا اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ آپ نے ۱۹۳۵ء میں منشی کا امتحان فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا اور ۱۹۳۶ء میں کرسچین کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ انٹر میں آپ نے دو سال فارسی پڑھی۔(۲)

اس کے بعد اعلی تعلیم کے لیے لکھنو چلے گئے، تعلیم کے اعلی مراحل آپ نے لکھنو یونیورسٹی میں طے کیے، جہاں فارسی و اردو کے نامور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی نگرانی میں 'احوال وآثار ظہوری' پر ۱۹۴۵ میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد 'عادل شاہی دور کے فارسی شعرا' پر اسی

یونیورسٹی نے ۱۹۵۰ء میں آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ اس کے علاوہ اردو میں بھی آپ نے موسیقی پر ابراہیم عادل شاہ کی نہایت اہم کتاب 'نورس' کی تصحیح وتدوین کا کام انجام دیا، جس پر لکھنو یونیورسٹی نے ۱۹۵۵ء میں اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔(۳) یہی علمی لگن آپ کو ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند کی اسکالرشپ پر ایران لے گئی جہاں سے آپ نے فارسی قدیم، پہلوی اور جدید فارسی میں ڈپلومہ حاصل کیا۔

استاد ذبیح اللہ صفا، بدیع الزماں فروزانفر، استاد معین، استاد پرویز ناتل خانلری وغیرہ آپ کے ایرانی اساتذہ میں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ لکھنو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور تہران یونیورسٹی جیسی شہرۂ آفاق درس گاہوں سے آپ کا تعلق رہا۔ آپ نے انگریزی، اردو اور فارسی میں دو سو سے زائد مضامین و مقالات اور تقریباً تیس کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔

نذیر احمد کا نام علامہ شبلی نعمانی اور حافظ محمود شیرانی کے بعد لیا جاسکتا ہے۔ نذیر احمد نے محمود شیرانی کی سائنٹفک تحقیق کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا تحقیقی سفر تقریباً ساٹھ سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس طویل مدت میں فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں سیکڑوں مضامین، بیشتر فارسی ادب اور تحقیق وتصحیح متن ونسخہ شناسی کے حوالے سے لکھے اور ناقدین ادب سے خراج تحسین وصول کیا۔

مخطوطہ شناسی یا متنی تدوین ایک صبر آزما عمل ہے۔ مخطوطہ شناسی ایک فن ہے۔ اس میں سب سے اہم مسئلہ خط کی پہچان کا ہے اور اس کے لیے وسیع مطالعہ درکار ہوتا ہے کہ کس دور میں کون سا خط رائج تھا۔ نذیر احمد نے مخطوطہ شناسی کی مشکلات کو جزو زندگی بنالیا اور تادم آخر اسی کام میں لگے رہے۔ متنی تحقیق کے سلسلے میں ان کی چند گراں مایہ تحقیقات درج ذیل ہیں:

(1) مکاتیب سنائی: پروفیسر نذیر احمد نے پہلی کتاب مکاتیب سنائی تدوین کی۔ اس کتاب کا متن پانچ معتبر مخطوطوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ مکاتیب سنائی تقابلی تحقیق کا اعلی نمونہ ہے۔ اس کتاب میں حکیم سنائی کے سترہ خطوط، ایک مقدمہ اور خطوط کے بارے میں مفصل تعلیقات، آخر میں ایک فہرست اور انگریزی میں مختصر مقدمہ بھی ہے جو ۱۹۶۲ء میں مطبع رام پور سے شائع کی گئی۔(۴) نذیر احمد نے مقدمے میں حکیم سنائی کے حالات پر بھی بحث کی ہے۔ ان خطوط میں مستعمل آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد حاشیے میں لکھا گیا ہے۔ فقرات ومحاورات، اقوال وضرب الامثال اور اشعار وغیرہ کے حوالے درج کیے گئے ہیں۔

(2) دیوان سراجی: سید سراج الدین خراسانی ساتویں ہجری کے شروع دور کا شاعر ہے۔ نذیر احمد نے اس کا دیوان دو معتبر نسخوں کی مدد سے تدوین کیا۔ ایک نسخہ استاد سعید نفیسی کے پاس تھا جو انھوں نے

نذیر احمد کو عاریتاً دیا اور دوسرا نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھا۔انھوں نے اس پر ایک مختصر مقدمہ فارسی میں اور مفصل مقدمہ انگریزی میں بھی لکھا جو ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوا۔

(3) **دیوان عمید لویکی:** عمید لویکی کا شمار ناصرالدین محمود و غیاث الدین بلبن کے عہد کے معروف شاعروں میں ہوتا ہے۔نذیر احمد کو ممبئی میں اس کے دیوان کا ایک مخطوطہ ہاتھ آیا جس کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں عمید ازرقی اور بدر چاچ کے اشعار بھی ہیں۔انھوں نے عرفات العاشقین، خلاصۃ الاشعار، مجموعہ لطایف و سفینۂ ظرایف و منتخب التواریخ بدایونی سے مقابلہ کیا و متن کو حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا اور انگریزی میں مفصل مقدمہ اور فارسی میں مختصر مقدمہ، حواشی و تعلیقات کے ساتھ لکھا۔ ۱۹۸۵ء میں مجلس ترقی اردو لاہور نے اسے شائع کیا۔اس میں قصیدہ، قطعات، ترکیب بند اور رباعی شامل ہیں۔

(4) **فرہنگ قواس:** فرہنگ کی تصحیح و تنقید ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن نذیر احمد نے اس میدان میں قدم رکھا اور ایک کامیاب فرہنگ شناس کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔اس کام کے لیے گہری علمی بصیرت اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔فرہنگ قواس فخر الدین مبارک شاہ قواس غزنوی کی تالیف ہے جس کا تعلق علاء الدین خلجی کے عہد سے تھا۔یہ فرہنگ ساتویں صدی ہجری کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں لکھی گئی۔یہ فارسی زبان کی دوسری فرہنگ ہے۔نذیر احمد نے ایشیاٹک سوسائٹی کے ناقص الطرفین مخطوطہ کی بنیاد پر فارسی کے مختلف لغتوں کی مدد سے تیار کیا۔ ۱۹۷۴ء میں (بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب) تہران سے مفصل مقدمہ و حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی۔

نذیر احمد نے اپنے مقدمے میں فرہنگ قواس کی تالیف کا سبب، انتساب، مندرجات، مآخذ و منابع، لغت فرس اسدی اور فرہنگ قواس کے معانی و مفاہیم کے بیان میں مماثلت، فرہنگ قواس کی دیگر خصوصیات، دوسری فرہنگوں سے اس کا مقابلہ، اس کی بعض غلطیاں، زبان و بیان اور اس کے قلمی نسخوں کا مفصل تعارف پیش کیا ہے۔

(5) **دستور الافاضل:** حاجب خیرات دہلوی نے ۷۴۳ ہجری میں اس فرہنگ کو مکمل کیا۔مولف کا تعلق محمد بن تغلق کے عہد سے ہے۔نذیر احمد نے ایک ناقص مخطوطہ جو کہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے، کی بنیاد پر اس فرہنگ کا متن مرتب کیا۔اس کا شمار بھی ہندوستان کے قدیم ترین لغتوں میں ہوتا ہے۔اس کی تدوین میں مختلف لغتوں اور شعرا کے دواوین سے استفادہ کیا ہے۔اس فرہنگ میں بعض الفاظ کے معانی میں مولف سے تسامح ہوا ہے جس کو نذیر احمد نے حاشیے میں درج کر دیا ہے۔یہ کتاب بنیاد فرہنگ، تہران سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

(6) **فرہنگ لسان الشعرا:** اس کا پورا نام 'لسان الشعرا و بیان الفضلا' ہے۔یہ فرہنگ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں لکھی گئی۔اس کی تالیف کا معین سال معلوم نہ ہو سکا۔مولف کا نام بھی معلوم نہیں ہے، البتہ کتاب کے ایک قصیدہ میں عاشق تخلص استعمال ہوا ہے جس کی بنیاد پر نذیر احمد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کے مولف کا تخلص عاشق تھا۔نذیر احمد نے دو مخطوطوں کی بنیاد پر اس کا متن تیار کیا اور انگریزی اور فارسی میں مقدمہ لکھا۔آخر میں الفاظ کی الفبائی فہرست بھی درج کی ہے۔یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں مرکز تحقیقات فارسی، دہلی کی طرف سے شائع ہوئی۔(۵)

(7) **نقد قاطع برہان مع ضمائم:** نذیر احمد نے میرزا غالبؔ دہلوی کی کتاب قاطع برہان پر نقد بعنوان قاطع برہان لکھی۔فرہنگ نویسی سے دلچسپی کے باعث آپ نے غالب کی قاطع برہان پر گہری نظر ڈالی ہے۔غالب دہلوی نے فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع (از محمد حسین تبریزی) پر تنقید کی تھی۔نذیر احمد نے برہان قاطع کے مولف اور غالب دہلوی دونوں سے جو تسامحات ہوئے ہیں ان کی عالمانہ وضاحت کی ہے۔اس کتاب کے اصل موضوع پر سیر حاصل تبصرے کے علاوہ نذیر احمد نے قاطع برہان کے مطالعے کے ضمن میں چند مقالات بھی شامل کیے ہیں جو ان دونوں لغتوں کی تفہیم میں معاون ہیں۔

(8) **دیوان حافظ** (مبنی بر نسخہ خطی گورکھپور، مورّخ ۸۲۴ ہجری): نذیر احمد کے تصحیحی کاموں میں سب سے زیادہ مقبولیت دیوان حافظ کے چار مخطوطوں کی ہے۔یہ چاروں مخطوطے دیوان حافظ کے قدیم ترین مخطوطوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔آپ نے حافظ شیرازی پر تقریباً بیس مقالے اردو، فارسی اور انگریزی میں لکھے۔ان سب مقالات میں سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہے کہ حافظ شیرازی فارسی کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہونے کے باوجود آج تک ان کا معتبر دیوان مدون نہ ہو سکا۔

آپ نے دیوان حافظ کا یہ نسخہ گورکھپور کے خاندان کی ذاتی لائبریری سے کشف کیا۔یہ نسخہ ۸۲۸ ہجری کا کتابت کیا ہوا ہے۔اس نسخے کی کئی غزلیں اور ابیات دیوان حافظ مرتبہ علامہ قزوینی میں نہیں ہیں بلکہ ان حصوں میں موجود ہیں جن کو علامہ قزوینی نے الحاق قرار دے کر دیوان سے خارج کر دیا ہے۔اس نسخے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قزوینی کی الحاقی غزلوں میں بعض اصل غزلیں بھی ہیں۔اس نسخے میں غزلوں کی تعداد صرف ۴۳۵ ہے۔نذیر احمد نے دیوان حافظ نسخۂ قزوینی، نیشنل میوزیم دہلی کا قلمی نسخہ اور دیگر دواوین کی مدد سے اس کو مرتب کیا۔انھوں نے اختلاف قرأت کو حاشیے میں لکھا۔اگر کہیں پر دوسری قرأت ارجح نظر آئی تو اس کی بھی وضاحت حاشیے میں کر دی۔

(9) **دیوان حافظ** (مبنی بر نسخۂ آصفیہ، مورّخ ۸۱۸ ہجری): دیوان حافظ کا یہ مخطوطہ کتب خانہ

آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے، جس کی کتابت ۸۱۸ھ میں ہوئی تھی۔ گویا یہ بہ اعتبارِ قدامت اب تک کے دریافت شدہ نسخوں میں دوسرے یا تیسرے درجے پر ہے۔ آصفیہ کا نسخہ ایک مجموعہ میں شامل تھا جس میں تین کتابیں تھیں، کلیلہ و دمنہ، منطق الطیر اور دیوان حافظ۔

پروفیسر نذیر احمد نے اس مخطوطے کو مرتب کیا اور اس پر ایک مفصل مقدمہ فارسی میں اور ایک مختصر مقدمہ انگریزی میں لکھا۔ آپ نے مقدمے میں مخطوطے کی خوبیوں اور کمیوں کو تفصیل سے اجاگر کیا ہے۔ علامہ قزوینی کے کلام حافظ کے الحاقی نظریے کے بارے میں مقدمہ میں تنقیدی بحث کی ہے۔ چونکہ یہ نسخہ علامہ قزوینی اور ڈاکٹر قاسم غنی کے تصحیح شدہ دیوان کے نسخہ خلخالی (کتابت ۸۲۷ ہجری) سے قدیم ہے، اس لیے اس میں بہت ساری غزلیں، قطعات و رباعیات موجود ہیں جو نسخہ خلخالی میں موجود نہیں۔ اسی لیے علامہ قزوینی نے ان کو الحاقی قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے نذیر احمد نے اس پر بحث کی ہے کہ یہ نسخہ اب تک مکشوف شدہ نسخوں میں دوسرے نمبر پر ہے اور اس میں جو کلام شامل ہے بغیر کسی قطعی دلیل کے الحاقی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ نسخہ آصفیہ میں غزلوں کی تعداد ۳۵۷ / ہے اور ۱۲ / قطعے اور ۲۰ / رباعیات موجود ہیں۔ تقریباً ۵۲ / ابیات غزل جو کہ آصفیہ میں ہیں نسخہ خلخالی میں موجود نہیں ہیں۔ نسخہ آصفیہ میں ۱۲ / قطعے ہیں اور نسخہ خلخالی میں ۲۹، جب کہ پانچ قطعے ایسے ہیں جو نسخہ آصفیہ میں ہیں اور نسخہ خلخالی میں نہیں ہیں۔ نسخہ آصفیہ میں ۲۰ / رباعیات ہیں۔ ان میں سے دو رباعی نسخہ خلخالی میں موجود نہیں ہیں۔ یہ دیوان ۱۹۸۸ء میں مرکز تحقیقات فارسی، دہلی کی جانب سے شائع ہوا۔

(10) غزلیات حافظ (مبنی بر نسخہ ۸۱۳ ہجری): یہ نسخہ کلام حافظ کے قدیم ترین نسخوں میں سے ایک ہے جس کی کتابت ۸۱۳ ہجری میں ہوئی۔ یہ نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے۔ نذیر احمد نے اس مخطوطے کی دریافت کی۔ اس مخطوطے میں چند چیزیں شامل ہیں۔

۱- نثر، منتخب خفی علایی از سید اسماعیل جرجانی ۲- انتخاب منظومات از شاعران ذیل:

کمال الدین اسماعیل، انوری ابیوردی، ظہیر فاریابی، سلمان ساوجی، شمس طبیب، سعدی شیرازی، عراقی ہمدانی، نظامی گنجوی، جلال طبیب اور حاشیے پر حافظ شیرازی، کمال خجندی، امیر خسرو، حسن سجزی، جلال طبیب اور عراقی کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ نذیر احمد نے مقدمے میں اس مخطوطے کی املائی خصوصیت پر طویل تبصرہ کیا ہے اور الحاقی کلام کے بارے میں بھی تبصرہ ملتا ہے۔ یہ کتاب بعنوان غزلیات حافظ ۱۹۸۸ء میں مرکز تحقیقات فارسی، دہلی کی جانب سے شائع ہوئی۔

(11) غزلہای حافظ (مبنی بر نسخۂ مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف) اس نسخہ کی دریافت بھی نذیر

احمد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اس نسخہ کی کاپی برٹش میوزیم سے حاصل کی اور دوسرا نسخہ دانشکدۂ کابل کی لائبریری سے مائیکروفلم کی شکل میں حاصل کیا۔ یہ مجموعہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے لے کر ۸۰۴ ہجری تک تیار ہوتا رہا۔ اس میں حافظ کی ۱۲۶ غزلیں اور ایک قصیدہ شامل ہے۔ یہ قصیدہ غزل نما ہے جو عام نسخوں میں نہیں ہے۔ ایرانی محققین حافظ سے اس غزل کا انتساب درست نہیں مانتے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں کہ یہ غزل لطایف اشرفی اور مکتوبات اشرفی کے مجموعہ و سفینہ ظرایف میں بھی درج ہے۔ اس مخطوطے کا شمار بھی قدیم ترین اور اہم ترین مخطوطوں میں ہوتا ہے۔ اس میں غزلیں حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہیں۔ اس نسخے میں بہت سارے اشعار کی قرأت دوسرے مخطوطوں سے مختلف ہے جو کسی شائع شدہ دیوان میں نہیں ملتے۔ نذیر احمد نے مقدمے میں اس بیاض اور مولف بیاض کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا مولف جام ہروی ہے، جس نے اس بیاض کو ہندوستان میں عہد فیروز شاہ تغلق میں لکھنا شروع کیا اور ایک مدت دراز میں اس کو مکمل کیا۔ سیف جام ہروی فارسی و عربی زبان کا استاد تھا۔ اس نے مجموعہ لطایف و سفینہ ظرایف کو فارسی اصناف سخن کے اعتبار سے کئی مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر صنف سخن کے لحاظ سے فارسی و عربی شعرا کا کلام درج کیا ہے۔ اس مجموعہ میں ایسے شاعروں کا کلام بھی ملتا ہے جن کا کلام حملہ تیمور میں ضائع ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے اس مجموعے کی اہمیت چنداں ہو جاتی ہے۔ یہ مجموعہ غزلہای حافظ کے نام سے ۱۹۹۱ء میں ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوا۔

(12) نورس: ۱۹۵۵ء میں اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود برابر کام کرتے رہنے کی وجہ سے آپ نے اردو ادب میں ڈی۔ لٹ کیا۔ آپ کی تحقیق کا موضوع ابراہیم عادل شاہ کی کتاب (نورس) تھی۔ یہ کتاب دکنی اردو میں موسیقی پر اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے پہلے اس کتاب کو ۹ نسخوں کی مدد سے تصحیح و ترتیب دیا پھر ان ۹ نسخوں کے آپسی تقابل کے بعد اردو میں ایک متن تیار کیا۔

اس کتاب کی زبان بہت مشکل ہے۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ نذیر احمد نے اس کے مقدمے میں بیان کیا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تصحیح میں کئی استادوں سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں بھارتیہ کلا کیندر، لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب انگریزی اور ہندی میں بھی ۱۹۵۶ء میں سنگیت اکادمی دہلی سے بھی شائع ہوئی۔ آپ نے نورس پر جو تعلیقات لکھی ہیں اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فن موسیقی کے ماہر ہیں۔

۱۹۷۷ء میں فارسی زبان و ادب میں گراں قدر خدمات کے لیے صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے آپ کو سرٹیفکیٹ آف آنرز سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے آپ کی تحقیقی و تنقیدی خدمات

کے پیش نظر فخر الدین علی احمد ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۸ء میں حکومت ہند نے آپ کو پدم شری کا خطاب دیا اور اسی سال انٹرنیشنل خسرو اکیڈمی امریکا نے آپ کی خدمت میں خسرو ایوارڈ پیش کیا۔ حافظ شیرازی پر وقیع تحقیقی کارناموں کے صلے میں حکومت ایران نے حافظ شناس کا خطاب دیا۔ ان کے علاوہ بھی آپ کو کئی غیر معمولی ایورڈ سے نوازا گیا۔ نذیر احمد تادم آخر علمی وادبی خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۸ء کو مالک حقیقی سے جاملے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ کارنامۂ نذیر، ص ۱۷
۲۔ ایضاً، ص ۲۵
۳۔ ایضاً، ص ۲۹
۴۔ ایضاً، ص ۸۸
۵۔ فرہنگ قواس، مقدمہ

....

کتابیات:

۱- نذیر احمد، مکاتیب سنائی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۶۲ء
۲- نذیر احمد، دیوان سراجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۲ء
۳- رضا جلالی نائینی ونذیر احمد، دیوان حافظ، آستان قدس رضوی، مشہد ۱۹۷۱ء
۴- نذیر احمد، دیوان حافظ، مرکز تحقیقات فارسی، خانہ فرہنگ ایران، نئی دہلی ۱۹۸۸ء
۵- نذیر احمد، غزلیات حافظ، مرکز تحقیقات فارسی، خانۂ فرہنگ ایران، نئی دہلی ۱۹۹۱ء
۶- نذیر احمد، فرہنگ قواس، رضا لائبریری، رامپور ۱۹۹۹ء
۷- نذیر احمد، فرہنگ لسان الشعرا، مرکز تحقیقات فارسی، خانۂ فرہنگ ایران، نئی دہلی ۱۹۹۵ء
۸- نذیر احمد، نقد قاطع برہان مع ضمائم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۸۵ء
۹- ریحانہ خاتون، کارنامۂ نذیر، انڈو پرشین سوسائٹی، دریا گنج، دہلی ۱۹۹۵ء

☆☆☆

Dr. Mohd. Amir Khan
CPCAS, SLL & CS,
JNU, New Delhi-110067,
Mob.9968333835
E-Mail: amir11jnu@gmail.com

'خلاصۃ التواریخ' میں تاریخی غلطیاں

عبدالرحمٰن انصاری

ہندوستانی فارسی ادب میں تاریخ نویسی کو ہمیشہ ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ شبہ قارۂ ہند میں عام طور سے جو تواریخ لکھی گئی ہیں وہ عمومی، اسلامی، علاقائی یا کسی خاص دور کے حالات وواقعات پر مبنی ہیں۔ فارسی مورّخوں نے عمومی اور اسلامی تواریخ میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی ہے جو ابتدائے آفرینش یا محمود غزنوی کے حملوں سے شروع ہوکر مولف کے زمانے تک کے احوال بہم پہنچاتی ہیں۔ اس سلسلے میں سجان رائے بٹالوی کی تالیف 'خلاصۃ التواریخ' جداگانہ اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ مصنف نے مذکورہ بالا موضوعات کو یکجا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ نیز انھوں نے اس میں ہندوستان کا محل وقوع، موسم اور اس کی خصوصیات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مزید برآں، مغلیہ سلطنت میں شامل صوبے، وہاں کے باشندوں کے عادات واطوار، رسم ورواج، اخراجات اور رقبہ کو بھی بیان کیا ہے۔

فارسی تواریخ میں ہندوستان کے عہد باستاں کا ذکر شاذ ونادر ہی ملتا ہے اور عموماً مورخین نے اس پہلو سے صرف نظر کیا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ سنسکرت زبان سے ناآشنائی رہی ہے جس کی بنا پر ہندوستانی قدیم تاریخی ماخذ تک رسائی ناممکن تھی۔ بادشاہ اکبر کے زمانے میں ادبا اور مورخین کی خاص توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی اور سنسکرت کی کئی اہم کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا جس سے استفادہ کرکے مورخین نے ہندوستان کے عہدِ قدیم کو اپنی نگارشات میں جگہ دی ہے۔ 'خلاصۃ التواریخ' کے مولف سجان رائے بٹالوی نے مہابھارت، راماین، ہری بنش (ہری ونش)، بھگوت گیتا، یوگ وششٹ، پدماوت، سنگھاسن بتیسی، راج ترنگنی اور راجاولی کے فارسی تراجم سے استفادہ کرتے ہوئے ہندوستان کی مجموعی تاریخ کا احاطہ کیا اور اس خلا کو پر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

موضوع کے اعتبار سے 'خلاصۃ التواریخ' کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ہندو عہد کی

تاریخ اور دوسرا مسلم عہد کی تاریخ۔ ہندو عہد کی تاریخ مذکورہ بالا کتابوں سے ماخوذ ہے، جب کہ مسلم عہد کی تاریخ کے لیے تاریخ سلطان محمود غزنوی تالیف مولانا عنصری، تاریخ سلطان علاء الدین خلجی، تاریخ فیروز شاہی تالیف ضیاء الدین برنی، تاریخ افاغنہ تالیف حسین خان افغان، ظفر نامۂ یزدی، تیمور نامۂ ہاتفی، تاریخ بابری، اکبر نامہ ابوالفضل، تاریخ اکبر شاہی تالیف عطا بیگ قزوینی، اکبر نامہ شیخ الہداد و منشی مرتضیٰ خان، طبقات اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، جہانگیر نامہ، تاریخ شاہجہانی تالیف وارث خان، تاریخ عالمگیری تالیف محمد کاظم، تاریخ کشمیر فارسی ترجمہ محمد شاہ آبادی (کشمیری زبان سے ترجمہ) اور تاریخ بہادر شاہی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

بظاہر سبحان رائے نے اپنی کتاب کی تالیف کے سلسلے میں معتبر و مستند کتابوں کا انتخاب کیا اور جا بجا ان کے تجزیے بھی کیے ہیں مگر درحقیقت وہ ان کو پرکھنے میں ناکام رہے ہیں مثلاً پدماوت کی داستان جو کہ ایک دلگداز عشقیہ کہانی ہے۔ اس کا نصف حصہ تخیل کی بنیاد پر ہے اور آخری نصف تاریخی حقیقت پر۔ سبحان رائے اسے حقیقت پر مبنی مانتے ہیں۔

اس مغالطے کہ وجہ سے سبحان رائے نے پدماوت کی داستان کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے اور موقع کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ رانی پدماوت کے حسن و جمال کا خاکہ سبحان رائے نے بڑے ہی دلکش انداز میں کھینچا ہے اور اس کو سن کر سلطان علاء الدین خلجی کے فریفتہ ہونے کی حکایت کو یوں بیان کیا ہے:

''...... بعد آن قصد تسخیر قلعہ چتور مصمم نمود۔ چون سلطان شنید کہ رائے رتن سین مرزبان چتور پدماوت نام نازنین در شبستان خود دارد کہ حسن و جمال او از قالب بیان افزونست۔ پری از مشاہدۂ جمال او از حسن خویش بری گشتہ و حور بہ رشک خوبی او در کنج تواری مستور شدہ، آفتاب از بہر نظارہ آن ہر صبح سر از دریچہ مشرق می برآرد و مہتاب خود را از حلقہ بہ گوشانش می شمارد، ورخسارش بہ حدی تابان کہ در شب تار مردم گمان برند کہ مگر صبح صادق از افق مشرق دمید، وسیمایش نوعی درخشان کہ اگر از پردہ ظلام نظر برآن افتد طلوع ماہ متصور می شود۔ خورشید با این ہمہ نور وضیا از آغاز صبح عارضش لمعہ بہ وام بگیرد و ماہ منبع انوار از چہرہ اش فروغ می خواہد۔'' (۱)

اس داستان کے بعد سبحان رائے بٹالوی نے پدماوت کے سبب تالیف کو بھی بیان کیا ہے:

''چنانچہ این قصہ رائے در اطراف ممالک معروف و مشہور است و کتابی مسمی بہ

پدماوت مشتمل بر قصۂ رائے رتن سین در زبان فرس و ہند درست شدہ۔'' (۲)

محمود غزنوی کے ہندوستان پر چودہ یا سترہ حملوں کی گواہی تقریباً تمام ہی تاریخی کتابیں دیتی ہیں۔ یہ بھی درج ہے کہ ان حملوں میں آخری حملہ گجرات کے سومنات مندر پر ہوا۔ اس حملے کے بعد محمود غزنوی نے سومنات مندر کے بت کے چار ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا مکہ، مدینہ، کوشک (۳) بھیج دیا گیا۔ چوتھے ٹکڑے کو غزنین کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے دفن کیا گیا۔ سبحان رائے بٹالوی نے محمود غزنوی کے دس حملوں کا ذکر کیا ہے جن میں سومنات کا ذکر نہیں ملتا۔ جن تواریخ کا ذکر سبحان رائے نے ماخذ کے طور پر کیا ہے ان میں سے طبقات اکبری میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مولف نے تاریخ کے اس اہم پہلو کو پس پردہ ڈال دیا۔ 'خلاصۃ التواریخ' میں سومنات سے متعلق یہ واقعہ تحریف شدہ صورت میں شامل کیا گیا ہے اور سلطان علاء الدین خلجی کی جانب اسے منسوب کیا گیا ہے:

''بعد آن بر سر گجرات لشکر عظیم تعین کردہ بہ محاربہ و مجادلہ بسیار، آن ولایت را مفتوح کردہ، بت سومنات را در دہلی آوردہ، در زمین فرو بردتا پی سپر خلایق گردید۔'' (۴)

ایسی ہی ایک روایت تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے جہاں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

''بتی را کہ بعد از فتح سلطان محمود غزنوی سومنات نام کردہ بودند و معبد ہندوان شدہ، از آن جا بکشیدند و در دہلی فرستادند و آن را پی سپر خلق کردند۔'' (۵)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ سلطان نے سومنات کے بتوں کو توڑ کر چار مختلف شہروں میں بھیجا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی کی رائے پر تکیہ کرتے ہوئے سبحان رائے نے بھی اس کو درست مانا ہے۔ فارسی شاعر فرخی سیستانی نے سومنات کی فتح کی مناسبت سے سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ایک قصیدہ 'فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر' لکھا تھا جس میں سومنات کے بت کے بارے میں بہت تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بت کو مکہ بھیجا گیا تھا۔ فرخی کے اس قصیدے سے سومنات کا بت اور اس کی تاریخ کی پوری وضاحت ہوتی ہے اور اسی بات کو منہاج سراج نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'طبقات ناصری' میں بیان کیا ہے۔ ان دلائل کی بنا پر یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ عدم تحقیق کی وجہ سے سبحان رائے غلطی کے مرتکب ہوئے۔ ان تمام وجوہات کے پیش نظر 'خلاصۃ التواریخ' کی ادبی و تاریخی اہمیت مختلف فیہ رہی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب اصغر نے 'خلاصۃ التواریخ' کی شہرت کا سبب یوں بیان کیا ہے:

''میرے نزدیک خلاصۃ التواریخ کی شہرت کا سب سے بڑا سبب اس کی اہمیت اور قدر کے بارے میں عہد حاضر کے مختلف محققین اور مورخین کے نظریاتی اختلاف اور ان

کا مختلف الرائے ہونا ہے۔ کیوں کہ اکثر ہندستانی اور یورپی مورخین اور محققین اس کی اہمیت اوراس کے مقام کے بارے میں ایک دوسرے سے جداگانہ رائے اور مختلف عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر سرلیس اور بیوریج اس کی اہمیت کے معتقد ہیں تو ایلیٹ و عبدالمقتدر وغیرہ اس کی اہمیت کے منکر ہیں۔''(۶)

اس کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف نے 'خلاصۃ التواریخ' کی تالیف میں سہل انگاری سے کام لیا ہے اوراسی وجہ سے اس کتاب میں مولف کا تحقیقی عنصر معدوم نظر آتا ہے جس کی وجہ سے تاریخی تسامحات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ بااین ہمہ، جہاں تک مسلمانوں کی تاریخ کی بات ہے، سجان رائے نے عہد وسطیٰ کے معتبر ماخذوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' تالیف کی ہے۔ جن کتابوں کی فہرست سجان رائے نے پیش کی ہے ان میں درباری تواریخ مثلاً تیمور نامہ، اکبر نامہ، طبقات اکبری، اقبال نامۂ جہانگیری، جہانگیر نامہ، تاریخ شاہجہانی وغیرہ اور غیر درباری تواریخ مثلاً تاریخ فیروز شاہی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ چونکہ مولف نے مطالب کو نقل کرنے میں تساہلی برتی ہے اوراسی کے ساتھ ساتھ تحقیق کی جانب کم توجہ دی ہے اسی لیے انھیں سرقہ بازی میں ملوث ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے برعکس بیوریج کہتا ہے:

''نامناسب نہیں ہوگا اگر ہم سجان رائے بٹالوی مولف 'خلاصۃ التواریخ' کو ہندوستانی ہیروڈٹس کہیں کیوں کہ دونوں ہی مورخین کے یہاں صحیح اور دلکش پیرائے میں لکھی تاریخ ملتی ہے۔ نیز دونوں بزرگوں کی کتابوں میں صحیح اور دلکش تاریخ نگاری کے عناصر موجود ہیں اور دونوں غیر جانب دار مورخ ہیں۔''(۷)

ڈاکٹر سید عبداللہ مولف 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' نے دونوں رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے میانہ روی اختیار کی ہے اوراس لحاظ سے ان کی رائے قابل قبول لگتی ہے اور پروفیسر علیم اشرف خان بھی اسی رائے کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی رائے کے مطابق:

''سجان رائے نہ تو ہیروڈوٹس کے ہم پلہ ہیں جیسا کہ بیوریج کا خیال ہے اور نہ ہی وہ دزد محض ہی ہیں جیسا کہ ایلیٹ کی رائے ہے، کیوں کہ سجان رائے کی 'خلاصۃ التواریخ' کچھ خاص وجوہات وعلل کی بنیاد پر دیگر تواریخ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے مختصر التواریخ کا اول وآخر حصہ تقریباً ناقص ہے۔ اس لیے یہ کتاب 'خلاصۃ التواریخ' سے نقل ہے۔''(۸)

بہر حال، خلاصۃ التواریخ کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور سجان رائے نے کوشش کی ہے کہ

ایجاز واختصار کے ساتھ ہندوستان کی مجموعی تاریخ کو ایک کتاب میں جمع کردیں۔ انھوں نے غیر ضروری چیزوں سے صرف نظر کیا اور صرف اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں وہ کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئے ہیں، مگر اکثر ناکام ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ان تمام فروگزاشتوں کے باوجود مجموعی طور پر اس کا شمار اس عہد کی اہم ترین تاریخوں میں ہوتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) خلاصۃ التواریخ ص۶
(۲) ایضاً ص۲۲۷
(۳) کوشک لعل یا کوشک محل، پایتخت سلاطین ہند
(۴) خلاصۃ التواریخ ص۲۲۲
(۵) تاریخ فیروز شاہی ص۲۰۱۔۲۰۲
(۶) تاریخ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، (تیموریان بزرگ از بابر تا اورنگ زیب) (۹۳۲-۱۱۱۸ ہجری) خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، لاہور، پاکستان، ۱۳۶۴ ہجری شمسی ص۴۶۶
(۷) جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، (سلسلہ جدید، جلد ۳) ۱۸۹۴ء، صفحات ۷۳۳-۷۶۸
(۸) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۶۵

☆☆☆

Abdur Rahman Ansari
Research Scholar Dept. of Persian,
University of Delhi-110007,
Mob. 9910673095
E-Mail: abdulrahman.falahi@gmail.com

کلام سعدیؔ پر قرآن وحدیث کے اثرات

محمد ریاض

مشرّف الدین بن مصلح الدین شیخ سعدیؔ شیرازی کی شخصیت اور علمی کارناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ شیخ سعدیؔ کے نوشت وسرود ہر لحاظ سے خاص طور پر شائقین زبان وادب اور عام طور پر تعلیم یافتہ اشخاص کے زبان زد رہتے ہیں۔ شیخ کی مشہورِ زمانہ مناجات تو اکثر لوگ اپنے گھروں میں بھی بطورِ ذکر و اذکار پڑھتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ شیخ سعدیؔ کا کلام جامع خوبیوں کا مرقع ہے۔ اس میں اخلاق اور پند ونصیحت کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور احادیث سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ فارسی ادب قرآن واحادیث کے استناد اور استشہاد سے بھرا پڑا ہے اور اس میدان میں خواجہ حافظؔ، مولانا رومؔ، شیخ عطارؔ، حکیم سنائیؔ، نظامیؔ اور عصر جدید میں علامہ اقبالؔ وغیرہ کے علاوہ بھی بیشتر شعرا وادبا نے اپنی نثر وشعر میں جابہ جا قرآن واحادیث کے کئی مفاہیم ومطالب بیان فرمائے ہیں۔

کلام باری تعالیٰ کی فصاحت وبلاغت، روانی وشیرینی اور دلکشی غرض تمام تر خوبیاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں چنانچہ شعرا وانشا پردازوں نے بھی اس کے اثرات قبول کیے۔ فارسی کے دیگر شعرا کی طرح شیخ سعدیؔ نے بھی اپنے کلام میں قرآن وحدیث سے استفادہ کیا ہے۔ سعدیؔ کے یہاں یہ استفادہ کہیں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے اور کہیں اشارتاً، جس سے شیخ کے کلام میں ایک منفرد وصف پیدا ہوگیا ہے۔ سعدیؔ شیرازی کے کلام میں قرآنی اثرات اور استشہاد کی ادنیٰ تحقیق ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

’’ یا اَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَ اُنْثیٰ وَ جَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْاْ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ‘‘ (سورۂ حجرات، آیت ۱۳)

ترجمہ: (اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے

بنائے تاکہ آپس میں پہچانے جاؤ۔ بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک اللہ جاننے والا خبردار ہے۔)

اسی طرح ذیل کی ایک حدیثِ نبوی بھی مذکورہ آیت ومفہوم پر صادق ہے:

’’عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ: مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی تَوَادّھِمْ وَ تَرَاحُمِھِمْ وَ تَعَاطُفِھِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَااشْتَکَی مِنْہُ عُضْوٌ تَدَاعَی لَہُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّھْرِ وَالْحُمَّی‘‘ (فتح الباری لابن حجر)

ترجمہ: (نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا کہ دوستی، رحم، محبت اور بھائی چارگی میں مومنوں کی مثال ایک جسم کی مانند ہے۔ اگر جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی درد یا تکلیف پہنچے تو دوسرے اعضا بھی اس ایک عضو کے درد کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔)

شیخ سعدیؔ کے شہرۂ آفاق حسب ذیل اشعار میں مذکورہ آیت شریف اور حدیث مبارکہ کا اثر ونفوذ واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس دنیا میں اولادِ آدم کے درمیان آپسی بھائی چارگی، امنیت اور انسانیت کو قائم ودائم رکھنے کے لیے سعدیؔ کے اشعار عین قرآن وسنت کے مطابق دنیا کو یکجہتی کا درس دیتے آئے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ ان اشعار کی مقبولیت کے ضمن میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جب دوسری جنگ عظیم میں انسانیت، امن، بھائی چارگی اور اخلاقی قدروں کا شیرازہ بکھرا تو کھوئی ہوئی انسانیت اور امن واخلاق کو بحال کرنے کے لیے ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ اولادِ آدم کو امن وانسانیت اور ہم آہنگی کا پیغام دینے کے لیے اقوامِ متحدہ کی عمارت پر شیخ سعدیؔ کے یہ فارسی اشعار لکھے گئے جن میں سعدیؔ قرآن وحدیث کے مذکورہ مفہوم سے متاثر ہیں۔ اشعار یہ ہیں:

بنی آدم اعضایِ یک دیگراند — کہ در آفرینش ز یک گوہراند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

اسی طرح سعدیؔ کے کلام میں جابہ جا قرآنی آیات کا اثر ونفوذ صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیت شریفہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے تقریباً یہی مفہوم شعری قالب میں پرو دیا گیا ہے:

’’تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَ الْأَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَیء اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لاَّ تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ اِنَّهُ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْراً‘‘ (الاسرا ، آیت ۴۴)

ترجمہ: (اس (اللہ) کی پاکی بولتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں

جو اسے سراہتی ہوتی، اس کی نہ بولے، ہاں! تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے، بے شک وہ حلم والا، بخشنے والا ہے۔)

مذکورہ بالا آیت کی طرف شیخ سعدی یوں اشارہ کرتے ہی:

کوہ و دریا و درختان ہمہ در تسبیح اند   نہ ہمہ مستمعی فہم کنند این اسرار

شیخ سعدیؔ کے جامع کمالات میں سے ایک کمال یہ بھی ہے کہ کہیں آیت قرآنی کی طرف اشارہ و کنایہ سے کام لیا ہے تو کہیں بعض اوقات مصرع کے اول یا آخر میں آیتِ قرآن یا پھر نص کا من وعن پیوند لگا دیا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیت کا مفہوم کل اور پھر مصرع کے آخر میں اس آیت کے آخری الفاظ شیخ نے کس حسن وخوبی سے پرو دیے ہیں:

'' يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِن مَّزِيْدٍ۔'' (ق، آیت ۳۰)

ترجمہ: (جس دن ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی تو وہ عرض کرے گی کچھ اور زیادہ ہے؟)

سعدیؔ شیرازی کہتے ہیں:

چو دوزخ کہ سیرش کنند از وقید   دگر بانگ دارد کہ هَلْ مِن مَّزِيْد

ایک دوسری آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آمرزش چاہتے ہیں اور کہتے ہیں:

''يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ '' (الطارق، آیت ۹)

ترجمہ: (جس دن کہ چھپی باتوں کی جانچ ہوگی۔)

شیخ سعدیؔ کہتے ہیں:

یا رب بہ لطف خویش گناہان ما بپوش   روزی کہ رازہا فتد از پردہ برملا

ایک جگہ حسبِ ذیل آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

'' مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔'' (فتح، آیت۲۹)

ترجمہ: (محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔)

اس آیت کی تائید میں سعدیؔ کہتے ہیں:

با بدان بد باش و با نیکان نکو   جایِ گل گل باش و جایِ خار خارا

اسی طرح اس آیت کی طرف اشارہ: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ'' (سورۂ نجم، آیت ۳)

ترجمہ: (اور وہ (محمد) کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے۔)

شیخ سعدیؔ قصیدے کے حسبِ ذیل اشعار کے آخر میں کس انداز سے مذکورہ آیت کی طرف اشارہ

کرتے ہیں:

چندی ہزار سکۂ پیغمبری زدہ   اول بہ نام آدمؑ و آخر بہ مصطفٰیؐ

الہامش از جلیل، پیامش ز جبرئیل   رایش نہ از طبیعت ونطقش نہ از ہویٰ

خاندان اہل بیت کی سخاوت پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں سورۂ دہر (جس کو سورۂ انسان بھی کہا گیا ہے) نازل فرمائی۔ شیخ سعدیؔ نے اپنے ایک شعر میں عین اسی سورہ اور اس کی آٹھویں آیت ''وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَ يَتِيْمًا وَ أَسِيْرًا'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کس را چہ زور و زہرہ کہ وصف علی کند   جبار در مناقب او گفتہ هَلْ أَتٰى

علاوہ بریں شیخ نے اپنے اشعار میں ایک جگہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا مفہوم بھی بیان کیا ہے۔ آیت یہ ہے: ''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ أَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ'' (ق، آیت۱۶)

ترجمہ: (اور بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں۔)

اسی مفہوم کو شیخ سعدیؔ یوں بیان کرتے ہیں:

دوست نزدیک تر از من بہ من است   وین عجب تر کہ من از وی دورم

چہ کنم با کہ توان گفت کہ او   در کنار من و من مہجورم

مذکورہ بالا نمونہ ہائے کلام کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شیخ سعدیؔ شیرازی کے کلام میں قرآن و حدیث کے مفاہیم، نکات اور تاثرات جا بہ جا دکھائی دیتے ہیں۔ سعدیؔ کے کلام میں یہ مطالب اور اثرات اتفاقی نہیں ہیں۔ چونکہ سعدیؔ جس قدر نثر و نظم میں یگانہ تھے بالکل اسی طرح دینی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے، بلکہ شیخ مدرسۂ نظامیہ بغداد کے سرخیل تھے جنھوں نے فارسی میں عین قرآن واحادیث کی روشنی میں دنیا کی بے ثباتی اور بالخصوص فتنۂ منگول میں کشت وخون سے متاثر ہو کر حاکمان وقت کو پند و نصیحت کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ سعدیؔ کے کلام میں یہ وصف تقریباً ہر جگہ جلوہ گر ہے جو ان کی شاعری کے لفظی اور معنوی حسن و زیبائش کو مزید بڑھا دیتا ہے۔

☆☆☆

Dr. Mohd. Reaz
AMU, Aligarh-202202
Mob.9149476391
E-Mail:mohdriazamu@gmail.com

ملاابوالبرکات منیرلاہوری:ایک اجمالی تعارف

صفی محمد نائک(ابن ناطقؔ)

ابوالبرکات منیرلاہوری گیارہویں صدی ہجری کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔وہ عہد شاہجہاں کے فارسی نظم و نثر کے بہترین نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔مولانا ابوالبرکات، منیرتخلص ۱۰۱۹ھ مطابق ۱۶۱۰ءکو لاہور میں پیدا ہوئے۔پہلے سخن سنج تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں منیر اختیار کیا۔صاحب تذکرۂ'مرأۃ الخیال' رقمطراز ہیں کہ"درابتدای فکرشعرسخن سنج تخلص می کرد، درآخرلفظ منیر دل پذیرش اُفتاد۔"(مرأۃ الخیال،ص۱۱۹)

منیرلاہوری کی خواہش تھی کہ وہ دربار سے وابستہ ہوں چنانچہ اس کا ذکر ان کے انشا میں بھی ملتا ہے۔۱۰۴۵ھ میں لاہور سے اکبرآباد(آگرہ) کارخ کیا اور اکبرآباد کے گورنر میرزا سیف خان کی طرف سے امیرمنشیان مقرر ہوئے۔منیرؔ کے اس دور کے منشآت'انشای منیر' کے نام سے معروف ہیں۔کچھ مدت بعد سیف خان بنگال کے گورنر مقرر ہوئے اور منیرلاہوری بھی سیف خان کے ہمراہ بنگال چلے گئے۔ ۱۰۴۹ھ میں سیف خان کی موت واقع ہوئی تو منیر لاہوری نے جونپور کے حکمران اعتقاد خان برادر سیف خان کی ملازمت اختیار کی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اکبرآباد واپس لوٹے اور اسی مقام پر ۱۰۵۴ھ میں وفات پائی اور ان کا جسد خاکی لاہور پہنچایا گیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

ابوالبرکات منیرلاہوری نے نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کی اور اپنی دلنشین اور زیبا تخلیقات سے فارسی ادب میں منفرد مقام حاصل کیا۔اگر ان کے منظوم ومنثور آثار کو تقابلی نگاہ سے دیکھا جائے تو بآسانی یہ بات واضح ہوگی کہ ان کی شہرت نظم کے مقابلے نثر پر زیادہ منحصر ہے۔تذکرۂ'ریاض الافکار' میں درج ہے:"درقلم و انشا طرازی صاحب سیف و القلم، و در خط معنی گستری شہنشاہ باحشم، در ہندوستان بہ عہدش نثری نویسی نشان ندادند۔"(Indo-Persian literature during shah jahan's time, P 334)

منیرلاہوری کے آثار منثور میں'کارستان'،'نوبادہ'،'کارنامہ'،'مناظرات منیر'،'تذکرۃ الشعرا'،'شرح قصائد عرفی'،'انشای منیر' اور'رقعات منیر' شامل ہیں۔مذکورہ کتابوں میں'تذکرۃ شعرا'،'شرح قصائد عرفی' اور 'رقعات منیر' کے علاوہ تمام آثار شائع ہو چکے ہیں۔ہم ان کے آثار کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں۔

(۱) کارستان: یہ کتاب ملامنیر نے جہانگیر نگر(ڈھاکہ) میں لکھی۔اس میں انھوں نے بادشاہوں کے افسانے اور ان کے جنگ کے احوال کا ذکر کیا ہے۔کارستان کا یہ نسخہ ۲۷رصفحات میں ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں لکھنو سے شائع ہوا۔(تذکرۂ شعرائے کشمیر،ص۷۷۴)

(۲) نوبادہ: یہ مجموعہ ابوالبرکات منیر نے ۱۰۵۱ھ میں ترتیب دیا۔اس مجموعے میں مکتوبات کے کچھ دیباچے شامل ہیں۔منیرلاہوری نے نوبادہ کا دیباچہ خود تحریر کیا ہے۔نوبادہ ۱۸۸۲ء میں ۴۰رصفحات میں لکھنو سے شائع ہوا۔

(۳) کارنامہ: کارنامہ،منیر کا ایک رسالہ ہے جو چار شاعروں یعنی زلالیؔ،عرفیؔ،طالب آملیؔ اور ظہوریؔ کی شاعری پر کیے گئے اعتراضات پر مبنی ہے۔مصنف نے یہ رسالہ خوبصورت نثر میں تحریر کیا ہے۔کارنامہ ڈاکٹر سید محمد اکرام کے توسط سے مرکز تحقیقات ایران و پاکستان،اسلام آباد سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔(تذکرۂ شعرائے کشمیر،ص۷۷۴)

(۴) ابوالبرکات نے کچھ مناظرات بھی تحریر کیے ہیں جیسے'مناظرۂ چار عنصر' جس میں آگ،ہوا، پانی اور مٹی کے درمیان مباحثہ شامل ہے۔اس مناظرے کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے"آغاز سخن بہ نام جہان آفرینی کہ عالم کون وفساد را از چہار عنصر انتظام بخشید۔"(تذکرۂ شعرائے کشمیر،ص۷۷۴)

دوسرا مناظرہ'مناظرہ تیغ وقلم' ہے جس میں قلم اور تیغ کے درمیان گفتگو شامل ہے۔اسی طرح ایک مناظرہ'مناظرۂ روز و شب' اور آخری مناظرہ'قلم وسخن' کے درمیان ہے۔یہ تمام مناظرات بہ ترتیب ۱۸۵۶ء،۱۸۶۷ء،۱۸۷۸اور ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئے۔(تذکرۂ شعرائے کشمیر،ص۷۷۴)

(۵) تذکرۃ الشعرا: منیر لاہوری اپنی وفات سے دو سال قبل یعنی ۱۰۵۴ھ میں ہندوستان کے شعرا کے احوال وآثار کی جمع آوری میں لگ گئے۔۱۰۵۴ھ میں موت کی آغوش میں چلے گئے اور اپنے اس کام کو مکمل نہ کر سکے۔بہر حال ۱۰۶۵ھ میں محمد صالح کنبوہ نے اس تذکرے پر ایک مقدمہ لکھا جو ۲۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔یہ مقدمہ محمد صالح کی کتاب'بہار سخن' کے قلمی نسخے میں موجود ہے جب کہ منیر لاہوری کا 'تذکرۃ الشعرا' نایاب ہے۔(سرود ہا ونوشتہ ہای منیر لاہوری،ص۳۸)

(۶) شرح قصائد عرفی: منیر لاہوری نے عرفی کے قصیدوں کی شرح لکھی جو'شرح قصاید عرفی' کے

نام سے معروف ہے۔

(۷) انشای منیر: منشآت کا یہ مجموعہ ۱۹/ذیقعدہ ۱۰۵۰ھ میں ترتیب دیا گیا۔'انشای منیر' کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالبرکات نے کچھ مکتوب سیف خان کی طرف سے دوسرے امرا کو لکھے تھے۔''مکاتبی کہ از زبان سیف خان بہ بعضی خوانین ستودہ آئین، نگارش پذیر کلک بندہ منیر گردیدہ...... بہ تاریخ نوزدہم ذیقعدہ ہزار و پنجاہ ہجری بہ توفیق ایزد جمعیت بخش در این صفحہ فراہم آوردہ۔'' (انشای منیر، ص۶) 'انشای منیر' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۶ھ میں شائع ہوا۔

(۸) رقعات منیر: ابوالبرکات منیر کے رقعات کا ایک دلچسپ اور اہم مجموعہ ہے۔ اس نسخے میں ۶۴/رقعات ہیں۔ یہ رقعات منیر نے مختلف اشخاص کو مخاطب کر کے تحریر کیے ہیں جن میں مرزا حسین قاضی، مرزا صادق، مرزا صالح، نواب سعد اللہ خان، حافظ بندہ، اعتقاد خان، سیف خان، شاہ فیضان، چندر بھان، مرزا حکیم، نواب بیدل خان، میر مومی، مرزا جلالہ، مرزا علی، محمد طاہر، مرزا محمد جعفر، محمد عالم، مرزا فیاض، حکیم محمد، مرزا کامران بیگ، مرزا محمد غنی، مرزا محمد حسن، محمد مسعود وغیرہ شامل ہیں۔ اس نسخے میں ان کے مناظرات بھی شامل ہیں۔ نسخے کے آخری حصے میں سیف خان اور اس کے باغ کی تعریف شامل ہے۔

ابوالبرکات منیر لاہوری بیک وقت ممتاز نثر نویس، شاعر، تنقید نگار اور کلاسیکی ادب سے بہرور معلوم ہوتے ہیں۔ منیر سبک ہندی کو نقادانہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے شعوری طور پر سبک ہندی سے دور ہوئے اور ہندوستان میں ایرانی الاصل فارسی زبان دانوں کی بہت سختی سے تنقید کی اور اربابان سخن کی زبان کو اجاگر کرنے کے لیے قائم مقام فراہانی سے دو صدی پہلے اپنی نثر کی زبان اور بلاغت کے اصولوں پر مبنی سادگی اور سرہ نویسی کی روایت قائم کی۔ لہٰذا منیر لاہوری کو سادہ نویسی کی تحریک میں ایک گمشدہ کڑی کی حیثیت سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادبی تحریک دسویں صدی ہجری میں ابوالفضل علامی کے ساتھ ہندوستان میں شروع ہوئی اور ایران میں قائم مقام فراہانی کے ساتھ تیرہویں صدی ہجری میں اوج پر پہنچ گئی۔

منیر لاہوری انشا پردازی کے ضمن میں ایک ممتاز اور انفرادی سبک کے حامل ہیں۔ انھوں نے قدما کے کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ اس لیے انھیں ہندوستان میں 'آغاز گر سبک بازگشت' کے نام سے یاد کیا جانا چاہیے۔

منیر لاہوری کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں ایرانی الاصل فارسی زباں دانوں کا پہلا نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ منیر کے عہد میں منشآت و رقعات فخر فروشی اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیے جاتے تھے۔ منیر نے

اپنے رقعات میں سب سے پہلے پیچیدہ معانی کو درکنار کیا اور تجسیم کی افراط سے دوری اختیار کی اور سادہ نویسی پر زور دیا۔ وہ اپنے بے مثال اسلوب کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

☆☆☆

کتابیات:

(۱) انشای منیر، عبدالرحمان راجی، غفران محمد، مطبع نظامی، کانپور

(۲) پس رو پیشنییاں سخن منیر لاہوری، (مقالہ) مہر السادات موسوی، فصل نامۂ مطالعاتِ شبہ قارہ دانشگاہ سیستان- بلوچستان، سال چہارم، شمارہ دہم، بہار ۱۳۹۱ش

(۳) تذکرۂ شعرائے کشمیر، مرزا محمد اصلح/سید حسام الدین راشدی، بخش سوم، اقبال اکیڈمی، لاہور ۱۳۴۶ش

(۴) تذکرۂ مرأۃ الخیال، خان لودی/امیر شیر علی، چاپ بمبئی

(۵) دانش نامۂ ادب فارسی، حسن انوشہ، جلد چہارم، وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، سازمان چاپ و انتشارات، تہران ۱۳۷۵ش

(۶) سرودہا و نوشتہ ہای منیر لاہوری، فرید اکرم، بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، تہران ۱۳۸۸ش

(۷) عمل صالح الموسوم بہ شاہجہان نامہ، تصحیح و تنقیح غلام یزدانی، جلد ۳، کلکتہ ۱۹۳۹ء

(۸) مجمع الافکار، تصحیح و تنقیح، پروفیسر چندر شیکھر، جلد دوم، نیشنل منش فار مین اسکرپٹس و دلی کتاب گھر، دہلی ۲۰۱۶ء

(9) Indo-Persian literature during shah jaha's time, Zakira Sharif Qasmi, Dept. of Persian, University of Delhi, 2016

☆☆☆

Safi Mohd. Naik
Research Scholar, Dept. of Persian,
D.U., Mob. 9868326552,
E-Mail: safinaik123@gmail.com

امیر خسرو دہلوی: ایک اجمالی تعارف

امرین عزیز

ہندو پاک نے فارسی کے تین بلند پایہ شاعر پیدا کیے خسروؔ، غالبؔ اور اقبالؔ۔ ان میں خسروؔ ہی ایسے شاعر ہیں جن کا مرتبہ اہلِ زبان بھی تسلیم کرتے تھے۔ مولانا جامیؔ ان کی نسبت بہارستان میں لکھتے ہیں:

''امیر خسروؔ دہلوی علیہ الرحمہ در شعر مستثنیٰ است۔ قصیدہ و غزل و مثنوی ورزیدہ و ہمہ بہ کمال رسانیدہ، تتبع خاقانی می کند۔ ہر چند در قصیدہ بہ وی نرسیدہ، اما غزل را از وی گزرانیدہ۔ غزل ہای وی بہ واسطۂ معانی آشنایی کہ ارباب عشق و محبت بہ حسب ذوق و وجدان خود درامی یابند، مقبول ہمہ کس افتادہ است۔ خمسۂ نظامی را بہ از وی کسی جواب نگفتہ۔

امیر خسرو جن کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین اور تخلص خسروؔ تھا۔ ۱۲۵۳ء میں پٹیالی میں (جو اب ضلع ایٹہ، کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے) پیدا ہوئے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان سے ہندوستان آئے تھے اور والدہ ایک نومسلم رئیس کی بیٹی تھیں۔ شاعری کا جذبہ فطری تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں تمام درسی علوم وفنون سے فراغت حاصل کر لی اور دربارِ بلبن کے ایک ممتاز رُکنِ ملک کتلو خان یا کشلو خان المعروف بہ ملک چھجو کے پاس جا کر ملازم ہوئے۔ اس کی تعریف میں آپ نے کئی قصیدے لکھے:

صبح را گفتم کہ خورشید کُجا است
آسماں روی ملک چھجو نمود!

برصغیر پاک و ہند میں بادشاہوں کے دربار ادبی، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ان درباروں تک رسائی عوام کی بجائے چند مقربین اور حاشیہ نشینوں کو میسر تھی جن کی سرپرستی میں شاعروں اور ادیبوں کا ایک مخصوص حلقہ علم و ادب کی آبیاری میں مصروف رہتا۔ ادب کے اس اشرافیہ

دائرے میں رہنے والے ادیب اور شاعر معاشی حوالوں سے فوائد بٹورتے رہتے تھے لیکن ادب کی صحیح معنوں میں آبیاری ان درباروں سے ہٹ کر بھی ہو رہی تھی اور ایسے عوامی دربار موجود تھے، جہاں ہر ملک اور ہر خطے کے انسان بآسانی رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ یہ صوفیۂ کرام کے آستانے اور خانقاہیں تھیں جہاں سے تمام انسان، روحانیت، صبر وسکون، قناعت اور توکل کا عملی درس حاصل کرتے رہتے تھے اور جن کی مبلغانہ کوششوں اور کاوشوں کی وجہ سے زبان و ادب کو بھی فروغ مل رہا تھا۔ صوفیۂ کرام برصغیر ہندو پاک کی عوامی فضاؤں میں جہاں زبان کو تنومند بنا رہے تھے اور ادب کے پودے کی آبیاری میں مصروف تھے وہیں انھوں نے روشنی پھیلانے کی اہم ذمہ داری بھی اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ انھوں نے اپنے خلوص، حسن اخلاق اور بے لوث خدمت کے ذریعے برصغیر کی روحانی فضا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس طرح برصغیر میں اسلامی تصوف کی عالمگیر تحریک شروع ہوئی اور شعر و ادب، فلسفہ اور روحانیت کو ایک ایسی سازگار فضا ہاتھ آئی جس کی بدولت زندگی کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔

امیر خسرو ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور بیشتر کتابیں اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیں۔ آپ نے اپنے پانچ دیوانوں میں خاصے طویل دیباچے خود اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ اکثر قصائد کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کب اور کس کی شان میں کہے گئے ہیں۔ یہ التزام مثنویوں میں بھی قائم ہے۔ البتہ کتابوں کی ترتیب میں آپ کے بعض دوستوں نے بھی مدد کی۔ مولانا جامی نے آپ کی تصنیفات کی تعداد ۹۹/ بتائی ہے۔ لیکن اب صرف ۲۲/ کتابیں دستیاب ہیں۔ مختصر طور پر ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تحفۃ الصغر: یہ آپ کے قصائد کا پہلا دیوان ہے جو ۱۲۷۲ء میں تصنیف ہوا۔ اس میں ۱۶/ سے ۱۹/ برس کا کلام ہے۔ اس میں کل ۳۵/ قصائد، پانچ ترجیع بند اور ترکیب بند، متعدد قطعات اور ایک چھوٹی مثنوی ہے۔ شروع میں وہ سلطانیؔ تخلص کرتے تھے۔

وسط الحیات: یہ تقریباً ۱۲۸۵ء میں مرتب ہوا۔ ان کے قول کے مطابق اس میں ۱۹/ سے ۲۴/ سال کی عمر کا کام موجود ہے۔ اس دیوان میں ۷۸/ قصائد، آٹھ ترجیع بند، متعدد قطعات اور رباعیات ہیں۔

غرّۃ الکمال: یہ دیوان ۱۲۹۴ میں مرتب ہوا۔ اس میں وہ کلام شامل ہے جو انھوں نے ۳۴/ سے ۴۳/ سال کی عمر تک کہے ہیں۔ اس میں ۹۰/ سے زائد قصائد، ترجیع بند اور مثنوی 'مفتاح الفتوح' کے علاوہ قطعات، رباعیات اور غزلیں بھی ہیں۔ خسرو نے اس دیوان کے شروع میں ایک طویل دیباچہ لکھا ہے جس میں اپنی سوانح حیات کے علاوہ فن شاعری اور اس کے اسالیب کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔

بقیہ نقیہ: یہ دیوان ۱۳۱۶ء میں مرتب ہوا جب خسرو ۶۴ ؍سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس دیوان میں ۶۳ ؍قصائد، ۶ ؍ترجیحات اور ۱۶۷ ؍بیت مثنوی کے، ۲۰۰ ؍قطعات، ۵۷۰ ؍غزلیں اور ۲۶۰ ؍رباعیات ہیں۔

نہایت الکمال: یہ دیوان ۱۳۲۵ء یعنی اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے مرتب کیا۔ اس میں ۲۲ ؍قصائد، ۵ ؍ترجیحات، ۴ ؍مثنویاں، متعدد قطعات، غزلیات اور رباعیات ہیں۔

مثنویاں: خسرو نے پانچ تاریخی مثنویاں لکھیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

قران السعدین: امیر خسرو کی پہلی مثنوی ہے جسے انھوں نے ۶ ؍ماہ کی محنت کے بعد مکمل کی۔ اس میں اشعار کی تعداد تقریباً ۳۹۴۴ ہے اور کیقباد اور بغرا خان کی ملاقات کا ذکر ہے۔

مفتاح الفتوح: امیر خسرو کی دوسری تاریخی مثنوی ہے جو ۱۲۹۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں جلال الدین خلجی کی ۴ ؍فتوحات کا ذکر ہے جو اسے ایک سال کے عرصے میں حاصل ہوئیں۔

عشقیہ یا عاشقیہ: یہ دولرانی خضر خان کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی کا قصہ یہ ہے کہ سلطان جلال الدین کا بیٹا خضر خان، گجرات کے راجا کی بیٹی دولرانی کے دام میں گرفتار ہے اور دونوں کی شادی کردی گئی۔ خضر خان نے اپنی رومانی داستان خود لکھی تھی جسے خسرو نے خضر خان کی فرمائش پر نظم کیا، لیکن اس کے سامنے پیش نہ ہوسکی کیونکہ خلجیوں کے سپہ سالار ملک کافور نے اس کو گوالیار کے قلعہ میں قید کردیا تھا اور قطب الدین مبارک خلجی نے اس کو قتل کرادیا۔ خسرو نے ان واقعات کو بھی بعد میں نظم کرکے شامل کردیا۔

نُہ سپہر: اس میں مبارک شاہ خلجی کے عہد کے واقعات لکھے گئے ہیں۔ اس کے نو باب ہیں ہر باب کی بحر جداگانہ ہے۔ اس مثنوی میں جنگوں اور فتوحات کے علاوہ ہندوؤں کے رسم و رواج، عقائد اور دہلی کی تاریخ کے متعلق اشعار موجود ہیں۔

تغلق نامہ: یہ بھی امیر خسرو کی تاریخی مثنوی ہے۔ انتقال سے کچھ عرصے پہلے لکھی گئی تھی۔ اس میں غیاث الدین تغلق کی لشکر کشی، خسرو خان کی شکست، تغلق شاہ کی دہلی میں فاتحانہ آمد اور تخت نشینی کا ذکر ہے۔

امیر خسرو نے خمسۂ نظامی کے جواب میں بھی پانچ مثنویاں لکھی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

مطلع الانوار: امیر خسرو کی اس تصنیف کا موضوع پند و نصیحت اور اخلاق و تصوف ہے۔ یہ نظامی گنجوی کی مثنوی 'مخزن الاسرار' کے جواب میں لکھی گئی ہے اور خسرو نے اسے دو ہفتے میں مکمل کیا۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۹۸ء ہے۔

شیرین خسرو: نظامی کی مثنوی 'خسرو شیرین' کے جواب میں لکھی گئی۔ اشعار کی تعداد ۴۱۳۴ ؍

ہے اور ۱۲۹۸ء میں مکمل ہوئی۔

مجنوں و لیلیٰ: نظامی کی مثنوی 'لیلیٰ و مجنوں' کا جواب ہے اور ۱۲۹۹ء میں مکمل ہوئی۔ یہ ۲۶۵۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔

آئینہ اسکندری: نظامی کی مثنوی 'اسکندر نامہ' کے جواب میں ۱۲۹۹ء میں لکھی گئی ہے۔

ہشت بہشت: نظامی کی مثنوی 'ہفت پیکر' کے جواب میں ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد ۳۳۵۰ ہے اور یہ ۱۳۰۱ء میں لکھی گئی۔

امیر خسرو کی نثری کتابیں

تاریخ علائی یا خزائن الفتوح: یہ علاء الدین خلجی کے عہد کی مختصر تاریخ ہے۔ اس میں ۱۲۹۵ء سے ۱۳۱۱ء تک کے حالات درج ہیں۔

اعجاز خسروی: یہ کتاب انھوں نے ۷۰ ؍سال کی عمر میں لکھا۔ یہ کتاب ۱۳۱۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔

افضل الفوائد: خسرو کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو بحیثیت شاعر:

امیر خسرو جامع کمالات شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ۔ خسرو کے اشعار ہر صنف سخن کے استادوں کے ہم پایہ ہیں۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکے اور سعدی قصیدہ گوئی کے میدان میں لاچار نظر آتے ہیں۔ انوری قصیدے کا بادشاہ ہے لیکن وہ غزل، مثنوی اور دوسری اصناف سخن کے سامنے بے بس ہے۔ حافظ اور نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل پائے لیکن خسرو کا کمال غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی سب پر محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے سے لے کر آج تک دانشوروں اور شاعروں نے ان کو بلند مرتبہ دیا ہے۔ 'غرّۃ الکمال' میں انھوں نے خود نہایت انصاف اور دیانت داری کے ساتھ اپنا مرتبہ مقرر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ خسرو شاعری کی تنقید کا بھی رچا ہوا مذاق رکھتے تھے چنانچہ اعلیٰ درجے کی شاعری کے لیے انھوں نے مندرجہ ذیل شرائط کو ضروری قرار دیا ہے۔

اول۔ شاعر نئی طرز و اسلوب کا موجد ہوتا کہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بن سکے۔

دوم۔ کلام میں آسانی، لطافت اور شیرینی ہو نیز شاعر کو چاہیے کہ اس کا نمونۂ کلام غلطیوں سے پاک

ہو۔ نیز اس کا انداز واعظوں اور صوفیوں جیسا نہ ہو۔

سوم۔ کلام اصل ہو، اس کی خود کی تخلیق ہو تا کہ سرقے کا گمان پیدا نہ ہو۔

خسرو نے اپنی شاعری میں ان تینوں شرائط کی سختی کے ساتھ پابندی کی اور ہندوستانی فارسی شاعری کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ وہ بجا طور پر طوطیِ ہند کہے جانے کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

کتابیات:

(۱) امیر خسرو دہلوی حیات اور کارنامے، پروفیسر ممتاز حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
(۲) امیر خسرو کی جمالیات، شکیل الرحمٰن، نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی
(۳) آب کوثر، شیخ محمد اکرام، کلاسیکل پرنٹرس، چاوڑی بازار، دہلی

☆☆☆

Amreen Aziz
Research Scholar Dept. of Persian,
AMU, Aligarh, Mob. 9927175671
E-Mail: amreenaziz54549@gmail.com

محمد ہادی کامور خان: حیات اور ادبی خدمات

آصف اقبال

محمد ہادی کامور خان ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا اصل نام چندی داس تھا جو بعد میں مشرّف بہ اسلام ہوا۔ وہ تبدیل مذہب کے بارے میں خود رقمطراز ہے:

> ''اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کا ایک واقعہ ہے کہ اورنگ آباد میں مجھ پر جن کا سایہ سوار ہو گیا اور ایک سال تک میں بستر پر لاچار پڑا رہا۔ کوئی بھی دوا یا علاج کارگر ثابت نہ ہوا۔ جب میں اپنے ایک خیر خواہ کے پاس چلا گیا تو اُس نے میری یہ حالت دیکھ کر کہا کہ یہ بیماری دوا اور علاج سے رفع نہیں ہوگی اس کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے۔ تم مسلسل اور متواتر دعائیں کروتا کہ تم صحت یاب ہوسکو۔ میں نے ویسا ہی کیا چالیس دن کے اندر صحت یابی اور شفا کے آثار نمودار ہوئے اور چالیس دن کے بعد میں صحت یاب ہو گیا۔''

محمد ہادی کامور خان ایک اچھا اور بہترین خطاط تھا۔ وہ کفایت خان جعفر خوش نویس کا شاگرد تھا۔ جب کفایت خان جعفر محمد ہادی کامور خان کو سلطان کے پاس لے گئے تو کامور خان نے اپنی خطاطی یا خوش نویسی کے دو نمونے خطِ نستعلیق اور خطِ شکستہ میں بادشاہ کو پیش کیے۔

محمد ہادی کامور خان خود کو ایک خانہ زاد کہتا ہے۔ لیکن اُس کے آبا و اجداد میں سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ آیا وہ خانہ زاد تھا یا نہیں۔ جولائی ۱۶۹۸ء میں بخشی الملک بہرہ مند خان نے اسے اورنگ زیب عالمگیر سے متعارف کرایا۔ چنانچہ اُس کو اورنگ زیب کی طرف سے حکم ملا کہ وہ میر محمد حسین جو دکن کا نائب دیوان اور بیجاپور کا دیوان تھا، کے ہمراہ دو سال تک رہے۔ ۲۲/ اپریل ۱۷۰۱ء کو جب سلطان پرنالہ کے قریب خیمہ زن ہوا تو محمد ہادی کامور اورنگ زیب کی طرف سے دربار میں آیا۔ بعد ازاں اُس کو حکم ملا کہ وہ

میر محمد حسین جو کہ فوج کا دیوان تھا اور چندی گڑھ و ڈنڈی گڑھ کے قلعوں کی سرمایہ کاری کے لیے مقرر تھا، اُس کے محکمہ میں شامل ہو جائے۔ تین ہزار اشرفی جو کہ فتح اللہ خان مغل کو تقسیم کرنی تھی وہ بادشاہ نے خود محمد ہادی کامور کے سپرد کی۔ تین دن کے اندر جون ۱۷۰۱ء میں میر محمد حسین کو بیدر کا دیوان بنا دیا گیا اور محمد ہادی کو بھی اُس کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ لیکن اچانک میر محمد حسین کو اورنگ آباد واپس لوٹنا پڑا تب تک محمد ہادی کامور خان نے بیدر کے نائب دیوان کا عہدہ سنبھالے رکھا۔

مئی- جون ۱۷۰۳ء میں جب اورنگ زیب کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا تو وہ دیوانِ اعلیٰ کے عہدے پر مقرر رہوا۔ خانہ جنگی کے دوران محمد ہادی کامور کے ساتھ کیسا سانحہ پیش آیا، اس کا کہیں پر ذکر نہیں ملتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اس دوران امپیریل کیمپ میں موجود تھے۔ جب شہزادہ محمد اعظم شاہ بادشاہ کے حکم سے مالوہ چلا گیا۔ بادشاہ کی وفات کے بعد اعظم شاہ اپنی ناشائستہ حرکات کا شکار بن بیٹھا۔ لیکن محمد ہادی کامور پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑا۔ بہادر شاہ نے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی اور اُس میں اعظم شاہ کو بھی شامل کر لیا۔ محمد ہادی کامور کی رسائی مہابت خان تک ہوئی جو کہ تیسرا بخشی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وزیر کا بیٹا تھا۔ جولائی ۱۷۰۷ء میں مہابت خان نے ان کا تعارف سلطان سے کروایا چنانچہ اُن کی سفارش پر کامور کے عہدہ میں ترقی کر دی گئی۔ لگ بھگ اسی وقت میں وہ رفع الشاہ کے رابطے میں آ گئے اور اُس کے محکمے میں شامل ہو گئے۔ وہ اس شہزادے کی خدمت میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ ۱؍نومبر ۱۷۰۸ء میں جب ابراہیم خان کابل کے ڈپٹی گورنر مقرر ہوئے تو اُس وقت وہ صوبہ کا سزاول مقرر رہوا۔ ۳۰؍جولائی ۱۷۰۸ء کو رفع الشاہ کہ سفارش پہ محمد ہادی کے عہدے کو اور ترقی ملی۔ شہزادے محمد ابراہیم نے اُسے میر سامان کے عہدے پر فائز کیا۔ اُس کے سرپرست شہزادے رفع الشاہ کی موت کے بعد وہ اپنے عہدے پہ برابر براجمان رہا۔ لیکن وہ غیر معمولی کارنامہ انجام نہ دے پایا۔ بالآخر وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گیا۔ جہاں دار شاہ کی سرپرستی میں صرف ناقص العقل اور بے حیثیت لوگوں نے ہی جاہ و منصب پایا۔

۲؍نومبر ۱۷۱۴ء کو شمس الدولہ کی سفارش پہ عظمت النسا بیگم کی دیوانی کے ساتھ ساتھ اُس کو ہفت چوکی اور داغ آتش گاہ کا امین بنا دیا گیا۔ اس کے بعد اگلے کچھ سالوں تک جو فتنہ و فساد بادشاہ اور سعیدوں کے درمیان برپا ہوا کرتا تھا اُس کا بھی محافظ بن بیٹھا۔ بعد ازآں اُس نے ظفر خان تک رسائی پائی جو کہ بادشاہ اور سعیدوں دونوں کے لیے قابل قبول تھا۔ ۲۵؍فروری ۱۷۱۹ء کو ظفر خان کی کوششوں کی وجہ سے احادیث، خزانچی اور والا شاہی کوٹ کا نگراں مقرر رہوا۔ بالآخر علی ملا خان کی سفارش پر ۴؍مئی ۱۷۲۱ء کو اسے مچھلی بندر داروغہ ڈاک کا سوانح نگار بنا دیا گیا۔ سوانح نگار کا عہدہ اس کے پہلے عہدے کی بہ نسبت کم درجہ کا تھا، اس لیے

اس نے اُس منصب کو ترک کر دیا اور دہلی میں پُرسکون زندگی کو ترجیح دی۔ 'ہفت گلشن' کے دیباچے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی قسمت کا اُتار چڑھاؤ اور سازشیں جو کہ کوٹ میں ہوئی تھیں، اُن سے وہ کبیدہ خاطر ہوا۔ نتیجتاً اس نے درویشوں اور بادشاہوں کی تواریخ کے مطالعہ پر اپنی زندگی صرف کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے مصنف کو ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس کا انتخاب کردہ بیٹا خدمت یاب خان پہلے ہی وفات پا چکا تھا۔ اُس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد اُس کی رفیق حیات نے بھی اس جہان فانی کو خیرباد کہہ دیا۔ مصنف نے اپنی تنہا روح کو سکون دینے کے لیے گزشتہ بادشاہوں کی تواریخ کی کتابوں سے جو صفحے مرتب کیے تھے اُنہیں دوبارہ سے ترتیب دینا شروع کر دیا اور دن رات کی محنت و کاوش سے تین کتابیں مرتب کیں۔

جو کتابیں پیغمبر اسلام کی سوانح حیات، متقی خلفا، امام اور دوسرے درویشوں کی کتابوں سے اقتباسات لیے تھے اُنھیں ایک جلد میں مرتب کر کے اُس کا نام 'گلدستہ سعادت' رکھا۔ جن سلاطین اور راجاؤں نے دہلی، مالوہ، دکن، بنگال، کشمیر، کابل اور لاہور میں مغلوں کے آنے سے پہلے حکمرانی کی تھی اُن کو ایک جلد میں 'ہفت گلشن' کے عنوان سے مرتب کیا۔ مغلوں کی تاریخ مصنف نے اپنے زمانے تک دو جلدوں میں مرتب کی اور اُس کا نام 'تذکرۃ السلاطین چغتا' رکھا۔

کامور خان نے اپنے دل کے درد و غم کو دور کرنے کے لیے اپنی زندگی کو تاریخ نویسی کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ پوری طرح سے اپنے ہمعصر مورخین کے رول اور اہمیت سے واقف تھا۔ مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ مورخین کو جہاں تک ممکن ہو سکے تاریخ نویسی میں غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ جب ہم اس کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے منصب کی تنزلی یا بڑھوتری سے افسردہ یا شادماں نہیں ہوا۔ اُس کا یہ عقیدہ تھا کہ تاریخ کی بنیاد سچ پر ہونی چاہیے اور مورخین کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری صلاحیتوں کو تاریخ نویسی میں بروئے کار لائیں اور مبالغہ آرائی سے گریز کریں۔ اس طرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نویسی میں واقعیات اور سوانح کو ضبط تحریر میں لانے میں کس حد تک معتبر اور مستند تھا۔

محمد ہادی کامور خان کی تاریخ، ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے مصنفین کی طرح بادشاہوں اور درویشوں کی تاریخ ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ بادشاہ کے کردار اور اس کی شخصیت تاریخی واقعات پر بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ اُس کے مطابق بہادر شاہ کے فضل و کرم اور رحم دلی نے عوام کے دل جیت لیے جب کہ فرخ سیر کے ظلم و تشدد نے عوام پر بُرے اثرات مرتب کیے۔ محمد ہادی کامور خان نے جو تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اُن کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہفت گلشن

'ہفت گلشن' ہندوستان کی ایک عمومی تاریخ ہے جو ۱۷۴۲ء تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ کتاب 'ہفت گلشن' کی ابتدا مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین کہ قدرت بالغہ و حکمت باصرہ او سبحانہ تعالیٰ و تقدس زبان را سخن و سخن را بہ معنی آشنا ساخت و فہم و ادراک را خمیر مایہ عقل کیاست گردانید تا بہ ذریعہ این مشت خاک شناسای قدرت نام ہای گشتہ لسان شیرین بیان عقیدت آگین را وحدانیت آفریدگار منزہ و مقدسہ تعالیٰ شانہ کہ قل ہو اللہ احد، اللہ الصمد، لم یلد و لم یولد، ولم یکن لہ کفواً احد، خطبہ احدیت اوست۔"

'ہفت گلشن' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سات ابواب پر منقسم ہے۔ ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ گلشن اول تین گلبن پر مشتمل ہے:

☆۔ گلبن اول دہلی کے فرماں رواؤں کے بارے میں ہے۔

☆۔ گلبن دوم شرقی بادشاہوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

☆۔ گلبن سوم میں مالوہ کے بادشاہوں کا ذکر ہے۔

۲۔ گلشن دوم دو گلبن پر مشتمل ہے۔

☆۔ گلبن اول میں احمد آباد گجرات کے بادشاہوں کا ذکر ہے۔

☆۔ گلبن دوم خاندیس کے فرمانرواؤں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۳۔ گلشن سوم بنگالہ کے بادشاہوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۴۔ گلشن چہارم چھ گلبن پر مشتمل ہے۔

☆۔ گلبن اول بہمنی سلاطین کے ذکر پر محیط ہے۔

☆۔ گلبن دوم بیجاپور کے بادشاہوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

☆۔ گلبن سوم میں حیدرآباد کے باشاہوں کا ذکر ہے۔

☆۔ گلبن چہارم میں احمد نگر کے بادشاہوں کا ذکر ہے، جو نظام شاہیوں کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔

☆۔ گلبن پنجم مملکت برار کے فرمانرواؤں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

☆۔ گلبن ششم برید شاہیوں کے ذکر کے بارے میں ہے۔

۵۔ گلشن پنجم دو گلبن پر مشتمل ہے۔

☆۔ گلبن اول میں سندھ کے بادشاہوں کا ذکر ہے جو جام کے نام سے معروف ہیں۔

☆۔ گلبن دوم ملتان کے بادشاہوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۶۔ گلشن ششم کشمیر کے بادشاہوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۷۔ گلشن ہفتم مشائخ کرام اور اکابر عظام کے بارے میں ہے۔

مصنف نے ان تمام ابواب میں ہر پہلو پر بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے اور تمام واقعات کو بڑی غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ کتاب کا اختتام جیسا کہ ظاہر ہے مشائخ اکرام و اکابر عظام کے ذکر اور اُن کی کرامات پر مشتمل ہے۔ 'ہفت گلشن' کے نسخے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور، انڈیا آفس لائبریری اور برٹش موزیم لندن میں محفوظ ہیں۔

تذکرۃ السلاطین چغتا

محمد ہادی کامور خان کی دوسری تصنیف 'تذکرۃ السلاطین چغتا' ہے جو خاندان تیموری بالخصوص ہندوستان میں محمد شاہ کے عہد کے ابتدائی کچھ سالوں پر مشتمل ہے۔ 'تذکرۃ السلاطین' چغتا مصنف کی اُن تین تصانیف میں سے ایک ہے جو اُس نے قیام دہلی کے دوران تصنیف کی تھی۔ یہ تاریخ نہ تو کسی حکمران کے حکم سے مرتب کی اور نہ ہی کسی بادشاہ کے نام منسوب کی بلکہ یہ کتاب اُنھوں نے تاریخ کے طالب علموں کی نذر کی ہے۔

مصنف نے 'ہفت گلشن' کو پایۂ تکمیل پر پہچانے کے بعد ۱۷۲۲-۲۳ء میں 'تذکرۃ السلاطین چغتا' کو لکھنا شروع کیا۔ 'تذکرۃ السلاطین چغتا' تاریخ چغتا کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ یہ کتاب ایک ضخیم جلد پر مشتمل تھی چنانچہ مصنف نے اُسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصہ ۲۲ رشعبان ۱۱۳۵ ہجری بمطابق ۱۷ رمئی ۱۷۴۳ء کو مکمل کیا جو ترکوں کے ظہور میں آنے اور چنگیز خان کی تاریخ، تیمور الگو بیگ، عبداللطیف اور اُس کے جانشین سلطان حسین کی وفات اور صفویوں کے ظہور میں آنے، بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر وغیرہ کے حالات و واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ حصہ دوم شاہجہاں، اورنگ زیب عالم گیر اور اُس کے بیٹوں کے درمیان معرکہ آرائی، بہادر شاہ کا عہد، بہادر شاہ کی موت، ۱۷۱۲ء کی خانہ جنگی، فرخ سیر کا عہد، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور محمد شاہ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم حصہ اورنگ زیب کے عہد کے بعد کا ہے کیوں کہ مصنف اُس عہد کے اکثر و بیشتر واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔ اُس نے جو حالات و واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے اُنھیں ہو بہو

نقل کر دیا۔ جس میں شک وشبہہ کی گنجائش بہت کم ہے۔ اس عہد کی یہ تاریخ تقریباً کورٹ کے روزمرہ کے واقعات، سوانح اور اخبارات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اُس عہد کے ہمعصر لوگوں کی کہاوتوں پر بھروسہ نہیں کیا۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اُس زمانے کی تقرری اور مختلف عہدوں پر فائز لوگوں کی مکمل فہرست بھی دستیاب ہے اور اُن کی اہمیت سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

’تذکرۃ السلاطین چغتا‘ کے پندرہ سے زیادہ نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ بانکی پور کی لائبریری میں اس کا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کے دو نسخے دستیاب ہیں جو خط نستعلیق اور شکستہ میں لکھے گئے ہیں۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ ایک عمدہ نسخہ ہے۔

مصنف کا طرز نگارش نہایت ہی عمدہ، سادہ، رواں اور شفاف ہے۔ خود مصنف سادگی و روانی اور فصاحت و بلاغت سے پوری طرح آشنا ہے۔ اس طرح وہ قارئین کو بھی متنبہ کرتا ہے کہ وہ غیر ضروری اور مترادف الفاظ کی بھرمار سے حتیٰ الامکان گریز کریں اور اپنے طرز نگارش میں سادگی و روانی اور فصاحت و بلاغت پر توجہ دیں۔

کتابیات:

(۱) دیباچۂ تذکرۃ السلاطین چغتا، محمد ہادی کامورخان، ترتیب وتصحیح مظفر عالم

(۲) ہفت گلشن، محمد ہادی کامورخان

(3) Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum London, By Charles Rieu, Voll-III

Asif Iqbal
Research Scholar Dept. of Persian,
AMU, Aligarh- 220201,
E-Mail: mohdasifmalik99@gmail.com

حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں پسماندہ بچوں کی عکاسی

ثنا غزل

حیات اللہ انصاری ایک مشہور ترقی پسند افسانہ نگار، ممتاز ناول نویس، نقاد اور صحافی رہے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ اردو ادب میں ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تین ناول ’لہو کے پھول‘ (۱۹۶۹ء)، ’مدار‘ (۱۹۸۱ء) اور ’گھروندا‘ (۱۹۸۲ء) تصنیف کیے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ’انوکھی مصیبت‘، ’بھرے بازار میں‘ (۱۹۳۵ء)، ’شکستہ کنگورے‘، (۱۹۴۶ء)، ’ٹھکانہ‘ (۱۹۹۲ء) منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ ’جدیدیت کی سیر‘ کے عنوان سے تنقیدی کتاب ۱۹۸۷ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ حیات اللہ انصاری کو گاندھی جی سے خاص عقیدت تھی، آخری وقت تک کانگریس سے جڑے رہے۔ اسی عقیدت کی بنا پر جواہر لال نہرو نے انھیں ’قومی آواز‘ کا مدیر مقرر کیا۔ اس سے قبل وہ ہفتہ وار ’ہندوستان‘ (۴۲-۱۹۳۷ء) کے مدیر تھے۔ بعد میں رسالہ ’سب ساتھ‘ (۸۵-۱۹۸۸ء) اور ’سچ رنگ‘ (۹۰-۱۹۸۸ء) کے لیے خدمات دیں۔ ’لہو کے پھول‘ کے لیے ۱۹۷۰ء میں ساہتیہ اکادمی انعام عطا ہوا۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ اردو کا سب سے طویل ناول ہے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے افسانے کم تخلیق کیے۔ لیکن ان کی تخلیقات ادبی حلقے میں سراہی گئیں۔ وہ قلیل سرمائے کے باوجود اپنی منفرد شخصیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کے مشہور افسانے ’آخری کوشش‘، ’ڈھائی سیر آٹا‘، ’شکستہ کنگورے‘، ’بھیک‘، ’ماں بیٹا‘، ’انوکھی مصیبت‘ اور ’بھرے بازار میں‘ ہیں۔ بقول اسلم جمشید پوری:

> ”’آخری کوشش‘ اردو کا لازوال افسانہ ہے۔ ’آخری کوشش‘ ’کفن‘ سے زیادہ کامیاب افسانہ ہے۔“ (۱)

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں بچوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ زیر نظر مضمون میں اُن

افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں بچے بطور اہم کردار کے یا ان کے مدمقابل کے طور پر شامل ہیں۔ میری نظر میں یہ افسانے توجہ کے مستحق ہیں، تاکہ بچوں کے کردار کو قارئین کے روبرو کیا جا سکے۔ حیات نے اپنے افسانوں میں غربت میں پل رہے بچوں کی نفسیات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی زندگی سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جن کو ایک وقت کا کھانا میسر نہیں، جو سماجی اور معاشی بدحالی کے شکار ہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں ڈھائی سیر آٹا، بھیک، بڈھا سود خوار، وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

''حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں سماج کے دبے کچلے طبقے کو اس کے صحیح سیاق میں حقیقی خدوخال کے ساتھ بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔''(۲)

حیات اللہ انصاری نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ افسانوں میں اپنے عہد کی سچائی اور تلخ حقیقت کو پیش کر کے سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ حیات اللہ انصاری کو انسانی نفسیات پر کامل دسترس حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت، دردمندی اور انسان دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال ان کے افسانے 'ماں بیٹا' اور 'موزوں کا کارخانہ' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہم ان کے چند ایسے افسانوں کا جائزہ لیں گے جن میں بچے خاص کردار کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'بڈھا سود خوار' ہے جو جون ۱۹۳۰ء میں رسالہ 'جامعہ' میں شائع ہوا۔ اس میں انسانوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

'بڈھا سود خوار' کا اہم کردار سدھارمل ہے جو مستقبل کی فکر میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کو اذیت پہنچاتا ہے۔ پیسہ بچانے کی فکر میں اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے۔ بیوی 'سیتلا' کے سخت اور شدید بخار میں ملوث ہونے کے باوجود اس کے لیے عرق منگوانے میں آنا کانی کرتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ خود کا علاج بھی نہیں کرتا کہ پیسے ختم ہو جائیں گے۔ درد کی وجہ سے لنگڑا کر چلتا ہے لیکن اس کے نزدیک دوا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''فائدہ دینا نہ دینا تو بھگوان کے اختیار میں ہے۔ لوگ سینکڑوں روپے دواؤں میں خرچ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ لالہ جگن ناتھ کہتے تھے کہ ایک دفعہ ان کے گاؤں میں بخار پھیلا، آدھا گاؤں تہس نہس ہو گیا۔ کسی ڈاکٹر وید کے کیے کچھ نہ ہو سکا تب کہیں سے ایک سادھو آ گیا جس نے لوگوں کو گولر کے پتے بتائے۔ لوگوں نے پینا شروع کیے۔ آٹھ ہی دن میں سب چنگے ہو گئے۔''(۳)

راجو، سدھارمل کا بیٹا ہے اس کو ماں کی بیماری دیکھی نہیں جاتی تو کہتا ہے کہ ڈاکٹر رام بہاری کو دکھا دیجیے۔ ہومیو پیتھک کی دوائیں سستی مل جاتی ہیں لیکن باپ کی دلیل کے آگے مجبور:

''بیٹا علاج سے کچھ نہیں ہوتا۔ صحت ہونا بھگوان کی مرضی پر ہے۔ لالہ خوشحال چند نے ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا دیا مگر نہ اچھے ہوئے۔ علاج تو ایک بہانہ ہے۔''(۴)

اس افسانے میں بچوں کے دو کردار اہم ہیں۔ پہلی نو برس کی بچی 'سندری' اور دوسرا اس کا بھائی 'راجو' دونوں سدھارمل کے بچے ہیں۔ دونوں کا ذہن بالکل مختلف ہے۔ سندری اپنی ماں کا خوب خیال رکھتی ہے۔ اپنے بھائی اور باپ کو کھلانے کے بعد اگر کچھ بچا تو خود کھاتی ہے۔ لیکن راجو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ کتاب خریدنے کے بہانے سے کلب کے لیے پیسہ مانگتا ہے۔ پوری کے لیے چار آنہ لیتا ہے لیکن اس میں سے بھی دو آنہ بچا کر رکھ لیتا ہے۔ گھر میں جب راجو کھانا کھاتا ہے تو اپنی بہن سے سخت الفاظ میں کہتا ہے:

''سندری یہ باسی روٹیاں تجھ سے نہیں کھائی گئیں۔ ایک روٹی یہ بھی کھا لی ہوتی۔ میں نے ہی پتاجی سے پیسے مانگے تھے اور مجھ ہی کو یہ بھی کھانا پڑے گی۔ میں پیسے نہ مانگتا تو پھر مزا معلوم ہوتا۔ دن بھر بھوکی پڑی رہتیں۔''(۵)

سدھارمل اس قدر سخت جان اور بیٹا پرست ہے کہ اس کو اپنی بیٹی، بیوی کے دوا درپن تو دور ان کے کھانے پینے تک کی کوئی فکر نہیں ہے لیکن بیٹے کا کھانا پوچھ لیتا ہے۔ پہلے خود کھاتا ہے اور بچی ہوئی تین روٹی میں سے دو راجو کے لیے رکھ دیتا ہے۔ اپنی بیٹی سے پوچھتا بھی نہیں کہ اس نے کھایا یا نہیں، یا وہ کیا کھائے گی لیکن اس کو اپنی نو سال کی بچی کی شادی کی فکر ضرور رہے۔ بیٹی سندری کے کہنے پر بھی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی ہے:

''اچھا لاؤ اس وقت کم ہی کھاؤں گا۔ دو روٹیاں اور یہ آلو راجو کے لیے رکھ دو۔''(۶)

بیٹی اور بیوی کی جانب سے اس قدر بے پروائی، لیکن شادی کی فکر سماج کے لیے ایک ایسا المیہ ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔ یہاں بیٹی کی شادی کی فکر پہلے کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی بنیادی ضروریات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسائل آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

سندری کے کردار کو حیات اللہ انصاری نے بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ نو برس کی یہ بچی والدین کی خدمت گزار ہے۔ اسے سب سے زیادہ ماں کی فکر ہے۔ ہر وقت بیمار ماں کا خیال رکھتی ہے۔ ماں کی تکلیف کو دیکھ کر باپ سے کہتی ہے:

''پتاجی اماں کے لیے عرق منگوا دیجیے۔ پیاس بہت ہے پانی پیتی ہیں تو کلیجے میں لگتا ہے۔''(۷)

'ڈھائی سیر آٹا' حیات اللہ انصاری کا اہم افسانہ ہے۔جس میں غریب بچوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔بھوکے بچوں کو کھانے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔دانے اور نوالے کو ترستے ان بچوں کو چاول پکنے کی بدبداہٹ راگنی معلوم ہوتی ہے۔ایک دن مولا کو سڑک پر گندھا ہوا آٹا ملا جسے ایک فقیرنی بھی چھینک کر چلی گئی تھی۔ماں نے اس آٹے سے پُوری بنائی اور گھر کے تمام افراد نے شکم سیر ہو کر کھایا۔اس دن بچے اپنی ماں سے کہتے ہیں ماں آج کہانی سناؤ، تو ماں نے بچوں کو شہزادے کی کہانی سنائی۔

ماہر نفسیات ماسلو نے انسانی ضروریات کا نظریہ پیش کیا ہے۔اس کے مطابق جسمانی ضرورتیں سب سے اہم ہوتی ہیں۔اس کی تکمیل کے بغیر انسان دیگر ضروریات کی طرف رخ نہیں کر سکتا۔کہا جاتا ہے کہ خالی پیٹ تو اللہ کی عبادت میں بھی مَن نہیں لگتا۔یہ حقیقت ہے کہ جاندار کی پہلی ضرورت پیٹ بھرنا ہے اس کے بعد ہی وہ کسی دیگر شے کے بارے میں سوچ سکے گا۔افسانے میں بچے ماں سے اسی وقت کہانی سنانے کو کہتے ہیں جب ان کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔یعنی پیٹ بھرنا ہماری سب سے اوّلین ضرورت ہے۔جب مولا گلی سے آٹا اٹھا رہا تھا تو کچھ مزدور اسے طعنہ دے رہے تھے کہ ہم غریب ہیں لیکن گلی کا گرا پڑا نہیں کھاتے۔یہاں بھی مولا عزت نفس کی فکر نہیں کرتا۔کیوں کہ وہ اس وقت تک سوچنے سے معذور ہے جب تک اس کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہوں۔

افسانہ 'بھیک' افسانوی مجموعے 'شکستہ کنگورے' میں شامل ہے۔اس کا اہم کردار رجنی نامی بچی ہے جس کی عمر تقریباً بارہ تیرہ برس ہے۔غربت کی وجہ سے وہ کافی کمزور اور دبلی پتلی ہے۔اسے دیکھنے سے ہی غربت جھلکتی ہے۔یہ بچی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا ماں کی طرح خیال رکھتی ہے۔والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے۔رجنی ان سبھی کے ساتھ ایک کھنڈر میں بھوک، ڈر اور بے بسی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔کیلاش ان کی زندگی میں امید کی کرن بن کر آتا ہے لیکن وہ بھی بچوں کی تعداد دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔صبح جس امید کے ساتھ وہ کیلاش کے پاس جاتے ہیں شام تک ناامیدی اور مایوسی کے ساتھ واپس لوٹ آتے ہیں، جہاں بھوک، پیاس اور ڈر ان بچوں کا منتظر ہے۔اس افسانے میں حیات نے بچوں کے جذبات کی کامیاب عکاسی کی ہے۔جب ننھے منے بچوں کا قافلہ یاس و امید کے ساتھ چلتا ہے تو ان کی معصومانہ باتیں سن کر قاری کے دل میں جذبات کی لہر دوڑ جاتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''کلو......اوپر پتا اور ماں ملیں گی۔''

منی ''نہیں۔الو، وہ نہیں، وہ تو مر گئے۔''

کلو ''جو مرتے ہیں کیا وہ اوپر بھی نہیں ملتے؟''

منی۔(بہت سنجیدگی سے) وہ کہیں نہیں ملتے۔ہم لوگ ایک بابو جی کے پاس جا رہے ہیں جو پتا جی ہی کی طرح روٹی دیں گے۔کپڑے دیں گے اور اوڑھنے کو دیں گے۔''(۸)

رجنی اس لیے مسرور ہے کہ اب اسے اور بہن بھائیوں کو کھانے پینے کے سامان اور کپڑے ملیں گے، اب انھیں وہاں پر ڈر بھی نہیں ہوگا۔خوشی سے سرشار یہ قافلہ پچاس فٹ سے زیادہ اونچا پہاڑ چڑھ جاتا ہے۔کیلاش بچوں کی تعداد دیکھ کر غصے میں رجنی سے کہتا ہے تم نے کل تو ایک بار بھی نہیں بتایا کی تمہارے پانچ بھائی بہن ہیں۔تم اتنی بڑی فوج کو لے کر آئی ہو، میں انھیں ہرگز نہیں رکھ سکتا۔کیلاش کی باتیں رجنی کے سر پر بجلی بن کر گری۔اسے اپنے بھائی بہنوں سے وقتی نفرت ہو جاتی ہے۔اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان سارے بچوں کو مار ڈالے۔اس جارحانہ کیفیات کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''یہ سن کر رجنی پر بجلی گر پڑی۔اتنی بڑی مایوسی کا سامنا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا اور آنکھیں اندر ڈوب گئیں مگر منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

اس کے سب بھائی بہنوں کا بھی یہی حال ہوا۔کلو تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔''(۹)

کیلاش کے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا کہ بچوں کو خالی ہاتھ واپس کرے، لہٰذا اس نے رجنی کو پاس بلا کر دو روپے بھیک میں دے دیے۔روپے لے کر رجنی بھائی بہنوں کے ساتھ بازار گئی اور سب نے پوری کھائی۔پھر وہ دو روپیہ ختم کر کے اپنی اسی اندھیری دنیا میں چلے گئے، جہاں بھوک کی شدت ان کا انتظار کر رہی تھی۔اس افسانے میں بچے، ماں باپ کے پیار اور بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔انھیں بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان تک میسر نہیں ہے۔کیلاش کے یہاں سے ناامیدی ہاتھ لگنے پر وہ دوسری طرف ایک نئی امید پر نکل پڑتے ہیں۔

'موزوں کا کارخانہ' افسانوی مجموعے 'شکستہ کنگورے' میں شامل ہے۔اس میں تین برس کے لارنس کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر روتا رہتا ہے۔اس کی ماں اسے نوکر کے حوالے کر کے کام کرنے چلی جاتی ہے۔لیکن نوکر بھی اسے کمرے میں بند کر دیتا ہے، تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں باہر نہ چلا جائے۔وہ بچہ صبح سے لے کر شام تک دروازے کے پاس کھڑا ہو کر روتا رہتا ہے۔اس کا ہر دن کا وہی معمول تھا۔وہ وہیں روتے روتے سو جاتا۔

جب پروفیسر (کتاب لکھنے کے لیے) لانس کے فلیٹ میں گئے تو بچے کے رونے کی آواز سن کر پریشان ہوئے۔انھیں دو دن میں ہی رونے کا مکمل ٹائم ٹیبل معلوم ہو گیا۔جب ان کا تجسس حد سے بڑھا تو

وہ بچے (لارنس) کو دیکھنے پہنچ گئے۔ اسے روتا دیکھ کر ان کے دل میں پیار کے جذبات امڈ آئے۔ وہ اس کو بلا کر پیار سے باتیں کرنے لگے۔ لارنس کی معصوم باتیں سن کر اسے خوب پیار کیا۔ اقتباس دیکھیے:

''بتاؤ کیوں روتے ہو''

''رونا آ کر مجھے رلاتا ہے۔''

اس جواب پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر پوچھا۔ رونا کہاں سے آتا ہے؟

بچے نے فوراً آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں سے''

پھر اسے خیال آیا کہ وہ غلط کہہ رہا ہے اور منہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''نہیں نہیں۔ یہاں سے۔'' لیکن فوراً اس غلطی کی بھی تصحیح کی اور پھر آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''نہیں نہیں دیکھیے یہیں ہے۔''

مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا۔ ''رونا آتا کیوں ہے؟'' بچے نے برجستہ جواب دیا۔

''مجھے رلانے کے لیے۔'' (۱۰)

لارنس سے گفتگو کرنا انھیں بھلا معلوم ہوا۔ پہلے وہ اس کے رونے سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اب اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرنے لگے۔ ان کو احساس ہو گیا کہ بچہ صرف پیار کا بھوکا ہے۔ ان کو بچے سے انسیت ہو گئی۔ لارنس ان کی ساری باتیں ماننے لگا۔ جب وہ کمرے میں اپنے مسودے پر کام کرتے تو لارنس ان کو کھڑکی سے دیکھتا رہتا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ان سے اتنا گھل مل گیا کہ ان کے کمرے پر کئی کئی چکر لگانے لگا۔ ایک رات وہ انکل کے پاس سونے کی ضد کرنے لگا۔ ماں اسے لے کر پروفیسر کے پاس گئی اور کہا کہ آج رات لارنس کو اپنے پاس سلا لیجیے۔ لارنس انکل کی جانب امید اور ڈر کے ساتھ دیکھتا رہا کہیں انکل خفا نہ ہو جائیں، لیکن جب انکل اس کو گود میں اٹھا لیتے ہیں تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ پھر گلے میں باہیں ڈال کر معصومانہ انداز میں کہتا ہے:

''میں بالکل نہیں بولوں گا۔ آپ کو کام کرنے دوں گا۔ آپ کی چیزیں بھی نہیں چھوؤں گا۔ پانی خود اٹھا کر پی لوں گا۔'' (۱۱)

جاتے ہوئے لارنس کی ماں اپنی تکلیف اور غم کا بیان ان الفاظ میں کرتی ہے:

''ایک بات میں اور کہہ دوں پروفیسر صاحب! جو میرے دل پر پتھر کی طرح رکھی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ میں بری عورت نہیں ہوں۔ اس کے باپ نے مجھے بلا وجہ طلاق

دی اور اب جس طرح بنتا ہے اپنا اور اس کا پیٹ پالتی ہوں۔'' (۱۲)

ماں اور بچے کی بات سن کر قاری کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے ماں اپنے بچے کو کمرے میں بند کر کے جاتی ہے۔ اس افسانے میں حیات اللہ انصاری نے ایک ایسی ماں کی سچائی کو پیش کیا ہے جس کا اس کے بچے کے سوا کوئی نہیں ہے۔

حیات اللہ انصاری کا ایک افسانہ 'ماں بیٹا' ہے۔ جو تقسیم کے بعد ہوئے فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کی خاص کردار 'مومنہ' نامی عورت ہے۔ فسادیوں نے اس کے گھر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے سامنے ماں، باپ، شوہر اور دودھ پیتی بچی کو قتل کر دیا گیا۔ فسادیوں نے عورتوں سے عصمت دری کی جس میں مومنہ بھی شامل تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کی سرحد سے قریب ہے۔ لیکن وہاں کا پورا گاؤں خالی ہے۔ ایک جگہ اللہ اکبر لکھا دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ ارادہ کرتی ہے کہ اب یہیں رہے گی۔

افسانے میں 'آشا' نام کی کتیا ہے جو مومنہ کو کہیں لے جانے کی کوشش کرتی ہے۔ مومنہ جب وہاں جاتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک چھ سال کا معصوم بچہ 'رامو' آگ میں جھلسا ہوا زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ وہ کھسک کر پرنالے کے نیچے گڑھے کو ٹٹول کر پانی تلاش کر رہا ہے۔ وہ درد سے کراہ کر ہائے ماں کی آواز نکال رہا ہے۔ لفظ 'ماں' سن کر مومنہ کی ممتا امڈ آئی لیکن اچانک رامو کے منہ سے 'ہے رام' کا لفظ سن کر اسے چھوڑ کر چلی گئی لیکن اس کی آنکھوں سے نیند غائب رہی۔ صبح اٹھتے ہی وہ فوراً رامو کے پاس گئی اور اس کی تیمارداری کرنے لگی۔ وہ اپنے رویے پر حیران تھی کہ اسے کیوں ہندو بچے پر پیار آ رہا ہے جب کہ انھوں نے ہی اس کی دنیا اجاڑ دی۔ اس کے ساتھ زنا کاری تک کی گئی۔

دوسری جانب رامو کو بھی مسلمانوں سے سخت نفرت ہے جنھوں نے اس کے گھر والوں کو قتل کر دیا۔ وہ انھیں مارنے کا طرح طرح سے منصوبہ بناتا ہے، تاکہ اپنا بدلہ لے سکے۔ مومنہ اس کا خوب خیال رکھتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ماں واپس آ گئی ہے۔ وہ مومنہ سے ان واقعات کو بیان کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ اس معصوم بچے کے دل میں اس قدر نفرت ہے کہ ایک بار مومنہ سے کہتا ہے کہ مسلمانوں سے کیسے بدلہ لے گا؟

''میں جب اچھا ہو جاؤں گا تو دو کام کروں گا۔ ایک تو ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گا اور دوسرے بم بنانا۔

مومنہ اس خوفناک خیال کو بھانپ گئی۔ ''پھر کیا کرو گے بیٹا؟''

''میں بہت سے بم ہوائی جہاز پر رکھ کر اڑ جاؤں گا اور جہاں دیکھوں گا کہ

کسی مسجد میں بہت سے مسلمان جمع ہیں ان پر بم گرا دوں گا اور اڑ جاؤں گا۔ بم گرے گا دھم۔ کسی کا کان اڑ جائے گا۔ کسی کی ناک اڑ جائے گی۔ کسی کا سر۔ کسی کا تو ند چیتھڑے چیتھڑے ہو جائے گا۔ کوئی روئے گا۔ کوئی ہائے ہائے کرے گا۔ کوئی اللہ کو پکارے گا۔''(۱۳)

رامو کو زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اتنے زخم دیے ہیں کہ اس کا معصوم ذہن نفرت، غصہ اور انتقام سے لبریز ہو چکا ہے۔ اس کے بچپن کو فسادیوں نے کچل ڈالا، اب وہ صرف مرنے مارنے کی باتیں کرتا ہے۔ افسانے کے اخیر میں اسے احساس ہوتا ہے کہ مومنہ مسلمان ہے۔ یہ حقیقت بھی اس کے سامنے عیاں ہوئی کہ ہندوؤں کو مسلمان قتل کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو ہندو مار رہے ہیں۔ وہ مومنہ سے پوچھتا ہے کہ تم کو لوٹنے والے لوگ ہندو تھے؟ مومنہ کہتی ہے کہ اس کا گھر دہلی کے قریب تھا۔ ہندوؤں نے میری ماں، باپ، بھائی، بہن اور دودھ پیتی بچی کو بے دردی سے قتل کر دیا اور جوان بہن 'مہرن' کو اٹھا لے گئے۔ پھر وہ کہتا ہے: ماں تم کتنی اچھی ہو۔ اگر تم چاہتی تو مجھ سے بدلہ لے سکتی تھی لیکن تمہارے اندر صرف دَیا ہے۔ ماں اب میں کسی سے بدلہ نہیں لوں گا بس اپنی بہن مہرن کو ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو میرا دکھ مت کرنا تبھی مجھے شانتی ملے گی اور میری بہن مہرن کے ساتھ میری ماں پریما اور بابا سورج پرشاد جس کو مسلمان اٹھا لے گئے ان کو بھی ڈھونڈ نکالنا۔ مومنہ نے صبر کا وعدہ اور دلاسہ دیا۔ میں تمہارے ماں باپ کو کھوج نکالوں گی اور جتنا پیار میں تم سے کرتی ہوں اتنا پیار میں پریما سے بھی کروں گی۔ مومنہ کی محبت نے رامو کی نفرت کو پیار میں بدل دیا۔ اس کے ساتھ ہی رامو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

''ایک بات اور ہے ماں۔ تمہارا جی چاہے تو مجھے دفن کر دینا میں تمہارا ہی بیٹا ہوں۔ ایشور کرے دوسرے جنم میں تم ہی سے پیدا ہوں اور تم ہی مجھے پالو پوسو۔''(۱۴)

مومنہ کے اندر اس کو جلانے یا دفنانے کی طاقت نہ تھی۔ وہ مردہ جسم کو بیٹھک میں رکھ کر دیوار پر یہ الفاظ لکھ کر چلی گئی:

''یہ لاش رامو کی ہے۔ وہ ہندو تھا۔ لیکن اس کی ماں مومنہ مسلمان تھی۔ اگر یہاں مسلمان آئیں تو اسے دفن کر دیں۔ ہندو آئیں تو پھونک دیں۔ مومنہ اگر زندہ بچی تو یہ احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنے یہاں ایک بار ضرور آئے گی۔''(۱۵)

افسانہ نگار نے رامو اور مومنہ کے کردار کے ذریعے انسانیت کے مذہب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیات اللہ انصاری کو انسانی نفسیات سے واقفیت ہے، بچوں کی نفسیات پر بھی ان کو مکمل عبور حاصل

ہے۔ ان کے افسانوں میں فن، تکنیک اور موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اسلوب کی وجہ سے وہ افسانوی ادب کی دنیا میں ہمیشہ ایک ستارے کی طرح چمکتے رہیں گے۔

حوالہ جات:

(۱) اکادمی، حیات اللہ انصاری نمبر، نومبر ۲۰۰۰ تا دسمبر ۲۰۰۱، ص ۹۶
(۲) ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ 1936 سے 1965ء تک، ڈاکٹر صادق، ص ۱۷۰
(۳) حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات، عشرت ناہید، ص ۴۹ (بڈھا سود خوار)
(۴) ایضاً، ص ۵۳
(۵) ایضاً، ص ۵۵
(۶) ایضاً، ص ۵۰
(۷) ایضاً، ص ۴۹
(۸) ایضاً، ص ۲۸۹ (بھیک)
(۹) ایضاً، ص ۲۹۱
(۱۰) ایضاً، ص ۲۱۴ (موزوں کا کارخانہ)
(۱۱) ایضاً، ص ۲۱۷
(۱۲) ایضاً، ص ۲۱۸
(۱۳) ایضاً، ص ۲۷۶ (ماں بیٹا)
(۱۴) ایضاً، ص ۲۸۴
(۱۵) ایضاً، ص ۲۸۴

☆☆☆

Sana Ghazal
Research Scholar Dept. of Urdu,
MANUU, Hyd. Mob.9369342152
E-Mail: sanagazal2012@gmail.com

’ترجمۂ ’چہار مقالہ‘ پر ایک نگاہ

علی اصغر عازی

یوں تو فارسی ادب کے وسیع دامن میں ہزاروں کی تعداد میں اخلاقی، علمی اور ادبی کتابیں موجود ہیں جن کی عالمی سطح پر عظمت و برتری مسلّم ہے لیکن ان تمام کتابوں میں ’چہار مقالہ‘ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسی لیے یہ کتاب ہندوستان کے نصاب تعلیم میں بھی ایک عرصے سے شامل رہی ہے۔ چونکہ فارسی زبان، مغلوں کے دور حکومت میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے ایک طویل مدت تک اس کی افہام و تفہیم میں ترجمے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن نظامی عروضی سمرقندی کی منشیانہ، پرتکلف اور عربی آمیز مسجع عبارتیں بہر حال شروحات اور تشریح لغات کی محتاج رہی ہیں۔ گزشتہ ساٹھ ستر سالوں میں، ہندوستان میں فارسی ادب کے انحطاط و زوال نے بہت ساری کتابوں کے ترجمہ کی ضرورت کا احساس دلایا جن میں سے ’چہار مقالہ‘ بھی ہے۔ اب تک اس کے کئی اردو ترجمے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں لیکن تمام ترجموں میں موجود اغلاط اور علمی فروگزاشتیں جدید ترجمے کی متقاضی تھیں۔ زیر نظر ترجمہ، اس کمی کا ازالہ ہے جو ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

نظامی عروضی سمرقندی، بارہویں صدی عیسوی کا ایک مشہور ادیب، نثر نگار اور شاعر ہے۔ چہار مقالہ کی تبویب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم نجوم اور علم طب میں بھی کما حقہ نبوغت کا حامل تھا، البتہ اس کے کامل کوائف زمانہ کی نیرنگیوں کے سبب تلف ہو چکے ہیں۔ بعض اہم ابتدائی حالات، اولین تذکروں میں دستیاب ہیں۔ فاضل مترجم نے اپنے مقدمے میں ان تمام مآخذ و منابع کا حوالہ نقل کیا ہے۔ کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے:

مقالہ اول: در ماہیت دبیری و کیفیت دبیر کامل و آن چہ بدان تعلق دارد
مقالہ دوم: در ماہیت علم شعر و صلاحیت شاعر

مقالہ سوم: در ماہیت علم نجوم و غزارت منجم در آن علم
مقالہ چہارم: در ماہیت علم طب و ہدایت طبیب و کیفیت او

زیر بحث ترجمہ کی کئی ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جو دیگر موجودہ اردو ترجموں میں نظر نہیں آتیں اور انھیں معنوی و لفظی خصوصیات کی بنا پر اس ترجمے کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ فاضل مترجم ڈاکٹر ذیشان حیدر نے ترجمے میں بڑی احتیاط، حزم اور فنی مہارت سے کام لیا ہے۔ موصوف کی فارسی زبان و ادب پر گرفت اور تسلط ادبی حلقے میں مسلم ہے۔ ہم یہاں ذیل میں بعض انفرادی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

• - اس ترجمے سے پہلے تراجم میں اس بات کی رعایت نہیں کی گئی تھی کہ متن و ترجمہ ایک ساتھ شائع ہوں۔ اس سہل انگاری کی وجہ سے طلبہ کو تطابق عبارت میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن موجودہ ترجمے میں صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ متن بھی شامل ہے۔ متن کے اندراج میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ترجمہ ساتھ ہی ساتھ رہے۔ مثلاً پہلے مکمل فارسی عبارت ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ ترجمہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

• - اس کی دوسری خاص اور اہم خصوصیت مشکل الفاظ و کلمات کی وضاحت ہے۔ مترجم موصوف نے الفاظ و کلمات کے تعین معنی میں دقت نظری کا ثبوت دیا ہے۔ بعض مقامات پر یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اگر چہ اس کا لغوی معنی مثلاً فلاں ہے لیکن عبارت میں موجود بعض قرائن کی وجہ سے دوسرا مرادی معنی لینا درست ہے۔ جیسے لفظ ’مرقوم‘ کے تحت لکھتے ہیں کہ اس کا معنی اگر چہ ’رقم کیا ہوا‘ ہے لیکن عبارت کا قرینہ اور سیاق و سباق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد ’مشغول ہونا‘ ہے۔ اسی طرح حل لغات کے ذیل میں واحد و جمع کا تعین بھی طلبہ کی مشکلات کم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم چیز علمی اور فنی اصطلاحات کی تشریحات ہیں۔ مصنف ’چہار مقالہ‘ چونکہ کئی فن پہ قادر تھا، اسی اعتبار سے مخصوص اصطلاحات کا جا بجا استعمال کرتا ہے۔ ایسی تمام تر مشکل فنی اصطلاحوں کی وضاحت بہت ہی خوبصورت پیرائے اور عام فہم زبان میں کی گئی ہے۔ مترجم نے تعین کے سلسلے میں کئی معتبر لغات کا سہارا لیا ہے۔ مثلاً لغت نامۂ دہخدا، فرہنگ معین، فرہنگ عمید وغیرہ۔ اسی طرح بعض کارآمد تعلیقات کو بھی نظر میں رکھا، جن میں تعلیقات علامہ قزوینی اور ڈاکٹر محمد معین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

• - اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے متن میں جہاں جہاں قرآنی آیات کا ذکر کیا ہے مترجم نے آخر کتاب میں سب کو مجموعی طور سے نقل کر دیا ہے۔

• - اسی طرح مصنف نے احادیث، روایات اور عربی امثال و حکم کا بھی سہارا لیا ہے جس کو مترجم

نے ایک جگہ نقل کر دیا ہے۔

• -مترجم نے متن میں مذکور بعض اہم اشخاص وقبائل کی وضاحت اور اسامی کو بھی یکجا کر دیا ہے۔

• -مصنف 'چہار مقالہ' نے اپنی تصنیف میں بعض کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جس کو مترجم نے مجموعی طور سے آخر کتاب میں نقل کیا ہے۔

• -اس ترجمے کی ایک اور خوبی جو دیگر تراجم میں نہیں ملتی، وہ 'چہار مقالہ' میں موجود اشعار کا ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے شائع شدہ تمام ترجموں میں اشعار کو بعینہ بلا ترجمہ نقل کر دیا گیا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں قاری کو کسی بھی طرح علمی، تحقیقی اور تنقیدی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

• -متن کی تصحیح بھی ایک دقت طلب اور باریک نظری کا کام ہے۔ مترجم نے اگر چہ علامہ محمد قزوینی کے تصحیح کردہ متن کو اساسی متن کے طور پر رکھا ہے لیکن دیگر نسخ 'مجمع النوادر' کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس لیے بعض مقامات پر ترمیم واصلاح بھی نظر آجاتی ہے۔

• -مترجم نے اگر چہ جداگانہ تعلیقات نہیں لکھا لیکن فرہنگ الفاظ کے ذیل میں بہت ساری اہم شخصیات اور قابل ذکر اماکن کا تعارف بسیط انداز میں کیا ہے۔ موصوف ترجمہ کے ذیل میں بعض ناگزیر اصطلاحات کی تعریف وتشریح کے ساتھ ساتھ مثالیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔ اس سے قبل کے ترجموں میں اس طرح کی رعایت نظر نہیں آتی۔ مثلاً رودکی کے مشہور قصیدے 'بوی جوی مولیان آید ہمی' کے ذیل میں صاحب 'چہار مقالہ' نے سات صنعتی محاسن شمار کیے ہیں اور اس کی تطبیق قارئین کے حوالے کر دی۔ مترجم نے اس طرح کے تمام تشنہ مطالب کو مفید تعلیقات کے ذریعہ مکمل کیا ہے۔

• -ان جملہ خصوصیات میں جو سب سے پہلے قارئین کی توجہ اپنی طرف جلب کرتی ہیں ان کا مختصر مگر نہایت مفید 'مقدمہ' ہے۔ مترجم نے اختصار کے ساتھ کتاب کے متعلقات پر تحقیقی بحث کی ہے۔

• -ترجمہ ایک نہایت دقت طلب فن ہے جس میں حزم واحتیاط کے ساتھ ایک زبان سے دوسری زبان میں مطالب ومفاہیم کو منتقل کیا جاتا ہے۔ موصوف نے بہت ہی نپے تلے اور اپنے مخصوص انداز میں اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ منشائے مولف کی ادائیگی کے ساتھ اردو عبارت سازی میں بھی ادیبانہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ درج ذیل اقتباس ترجمہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

''شاعری، صناعتی است کہ شاعر بدان صناعت، اتساق مقدمات موہمہ کند و التیام قیاسات منتجہ برآن وجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد، نیکو را در خلعت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند، و بہ ایہام قوت ہای غضبانی و

شہوانی را برانگیزد تا بدان ایہام، طباع را انقباضی وانبساطی بود۔ وامور عظام را در نظام عالم سبب شود چنان کہ آوردہ اند۔''

ترجمہ: شاعری ایک فن ہے جس کے ذریعہ شاعر اس طرح خیالی مقدمات کو ترتیب دیتا اور نتیجہ خیز قیاسات کو درست کرتا ہے کہ ادنیٰ معنیٰ کو اعلیٰ اور اعلیٰ کو ادنیٰ بنا دیتا ہے۔ اچھے کو برے لباس میں نمایاں کرتا ہے اور برے کو اچھی شکل میں ظاہر کرتا ہے اور صنعت ایہام کے ذریعہ غصہ وشہوت کی قوتوں کو ابھارتا ہے تا کہ اس ایہام کے واسطے سے طبیعتوں کو تنگی (ناگواری) اور کشادگی (خوشی) حاصل ہو اور (شاعری) دنیا کے انتظام میں عظیم امور کا باعث ہو جیسا کہ لوگوں نے بیان کیا ہے۔'' (ص ٦٢)

مافوق اقتباس اور ترجمہ سے ڈاکٹر ذیشان حیدر کا دونوں زبانوں پر تسلط اور عبور ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی تمام تر باریکیاں پوری کتاب میں نظر آئیں گی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل بھی آپ کی تالیفات ادبی منظر نامہ پر آتی رہی ہیں اور صاحبان فکر ونظر سے داد لیتی رہی ہیں۔ 'نصاب فارسی' کا اردو ترجمہ بہ نام 'آرسی' ایک زبردست علمی وادبی خدمت ہے۔ زیر بحث کتاب کے علاوہ موصوف کی ایک اہم تالیف 'ایران میں بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے چند معروف شعرا' بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ موصوف ادبی حلقے میں اپنی علمی نبوغت اور خوش خلقی کے باعث بہت مقبول ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کا یہ ترجمہ ادبی دنیا میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

☆☆☆

Ali Asghar Aazi
Research Scholar, CPCAS, SLL & CS,
JNU, New Delhi-67, Mob. 8957690564
E-Mail: asgharali640@gmail.com

نقش ہائے رنگ رنگ

ارشاد حسین

نعت پاک

جو نعت پاک کا دنیا میں کام کرتے ہیں
وہ پُر شرابِ محبت سے جام کرتے ہیں

ہے کائنات میں خلق عظیم کا حامل
یہ وصف خاص محمدؐ کے نام کرتے ہیں

زمیں پہ آپ کا سایہ نہیں تو پھر حیدرؑ
نبی کے واسطے سایہ کا کام کرتے ہیں

فقط ہے فاصلہ قوسین کا کہ ادنیٰ کا
کہاں پہ مرسَلِ اعظمؐ قیام کرتے ہیں

گناہگار فضاؤں کے گھپ اندھیرے میں
وہ نور اسوۂ حسنہ کو عام کرتے ہیں

مباہلے میں نصاریٰ یہ چیخ کر بولے
خموش چہرے تکلّم کا کام کرتے ہیں

کسی چمن کی طرف سے اگر گزر ہوجائے
درخت آپ کو جھک کر سلام کرتے ہیں

ہے کلمہ گویوں میں شامل جماد بھی ارشادؔ
نبیؐ کے ہاتھ پہ پتھر کلام کرتے ہیں

☆☆☆

Maulana Irshad Husain
Pura Maroof, Mau, U.P-275305
Mob. 8896740346

مکتوب بہ نام خلیق الزماں نصرتؔ (۱)

وکاس گپتا

مکرمی خلیق الزماں نصرتؔ صاحب!   آداب

آپ کی ارسال کردہ چار کتابیں بہت پہلے مل گئی تھیں۔ آپ کی محبتوں کا شکریہ۔ معذرت خواہ ہوں کہ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے آپ کو جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔

برٹش ناول نگار William Somerset Maugham (1874-1965) نے اپنے ناول 'Of Human Bondage' (1915) میں بڑی سچی بات کہی تھی کہ:

"People ask for criticism, but they only want praise."

اس لیے میں کسی کی شاعری یا کتاب پر اپنی رائے دینے سے گریز کرتا ہوں۔ اب تک میرے کئی دوستوں نے مجھ سے رشتہ اس لیے ختم کرلیا کہ انھوں نے مجھ سے اپنی شاعری یا اپنی کتاب کے بارے میں میری رائے جاننا چاہی اور میں نے ایمانداری سے اپنی رائے کا اظہار کردیا۔

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے   جس سے ملیے اسے خفا کیجے   جون ایلیا

سب سے پہلے میری نظر 'نصرت: فن اور شخصیت' پر پڑی۔ جس میں آپ کے نام مشاہیر کے ۱۲ خطوط شامل ہیں۔ مذکورہ کتاب میں دو اہم اور قابل ذکر خط ہیں۔ (۲) ندؔا فاضلی (مرحوم) اپنے خط میں رقم طراز ہیں کہ:

"آپ کے تحریر کردہ اشعار کے علاوہ بھی اور بہت سے اشعار ہیں جن کے تعلق سے ادبی حلقہ خاموش ہے۔ ایک شعر میں اپنے ایک استاد سے جو شاعر بھی تھے، سنتا رہا ہوں، اس شعر کو ماسٹر ریاضؔ انصاری کا سمجھتے تھے، لیکن ان کے شعری مزاج سے بالکل میل نہیں کھاتا، شعر یوں ہے:

ہر لحظہ ایک تازہ شکایت ہے آپ سے   اللہ! مجھ کو کتنی شکایت ہے آپ سے"

(نصرت: فن اور شخصیت، ص ۱۶۱)

یہ شعر جلال الدین اکبؔر کا ہے اور یوں ہے:

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے　　اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

آپ کے مطالعہ کے لیے پوری غزل پیشِ خدمت ہے:

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے　　اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

کیا آپ جانتے ہیں مجھے تو خبر نہیں　　کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے

اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں　　جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر　　شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے

اکبؔر وہ مہربان ہے جانِ جہاں تو پھر　　اہلِ جہاں کو ہو جو عداوت ہے آپ سے

چودھری جلال الدین المتخلص بہ اکبؔر ستمبر ۱۹۰۵ء میں موضع علی وال، ضلع گرداس پور میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں کیا۔ سید عابد علی عابدؔ کے شاگرد تھے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ کا مجموعۂ کلام 'نقش ارژنگ' سید عابد علی عابدؔ کے مقدمے اور مولانا حسن نظامی دہلوی، مولانا سید سلیمان ندوی، شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفیؔ دہلوی، نیازؔ فتح پوری، تاجوؔر نجیب آبادی، مرزا یاس یگانہؔ چنگیزی کی گراں قدر آرا کے ساتھ شائع ہوا۔ کلیات بھی 'نقوشِ اکبر' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

چھوٹی بحروں میں اکبؔر کی غزلیں حسرتؔ موہانی کا نقش ثانی معلوم ہوتی ہیں جس سے متاثر ہو کر مولانا سید سلیمان ندوی نے جلال الدین اکبؔر کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۱۸ر مارچ ۱۹۲۶ء میں اکبؔر کو پنجاب کا حسرتؔ موہانی کہا تھا۔ مولانا تاجوؔر نجیب آبادی بھی اکبؔر کو حسرؔت کا مثنیٰ کہتے تھے۔ ۸ر مئی ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔

☆☆☆

حنیف نقوی (مرحوم) اپنے خط مورخہ ۱۳ر جولائی ۲۰۱۱ء میں آپ کی کتاب 'برمحل اشعار اور ان کے مآخذ' کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

"اشعار کے مآخذ کے سلسلے میں انتخابات اور ادھر ادھر کی کتابوں کے حوالے دینے کی بجائے شاعر کے اصل دیوان یا کلیات کے حوالے دینے چاہیے تھے۔ زیادہ سے زیادہ تذکروں کے حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ زبانی حوالوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کلیات یا مجموعہ کلام کا حوالہ موجود ہے تو 'گلستان ہزار رنگ'، 'غزل انسائیکلو پیڈیا'، 'دبستان لکھنؤ'، 'تاریخ ادب اردو' یا 'ایوان اردو' کے حوالوں کی نہ کوئی وقعت ہے اور نہ ضرورت۔ جہاں تک شعر کے صحیح متن کے تعین کی ضرورت کا اصول ہے، شاعر کے کلام کے اصل اور معتبر نسخوں کی طرف

رجوع کرنا چاہیے۔" (نصرت: فن اور شخصیت، ص ۱۶۵۔۱۶۶)

میں ان کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ ان تمام کتابوں میں بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً غزل انسائیکلو پیڈیا کو ہی لیجیے۔ اس کے پہلے ہی صفحہ پر مندرجہ ذیل شعر غلام ہمدانی مصحفؔی کے نام درج ہے۔ یہ شعر غلام ہمدانی مصحفؔی کا نہیں ظہیرؔ دہلوی کا ہے۔

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار　　اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

(دیوان ظہیر (جلد اول)، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۹ء، ص ۱۲۶)

حنیف نقوی (مرحوم) نے جو اشعار درج کیے ہیں، ان میں مومن خاں مومنؔ کے شعر کے پہلے مصرعے میں 'زمین' کی جگہ 'جہان' ہے اور شعر یوں ہے:

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو　　یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

(کلیات مومنؔ، منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۲۸)

مرزا عظیم بیگ عظیمؔ کا شعر جو اس طرح زبان زد خاص و عام ہے:

گرتے ہیں اپنے زور میں شہ زور مثل برق　　وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

یہ دراصل مرزا عظیم بیگ عظیمؔ کے ایک مخمس کا آخری بند ہے جس کا چوتھا اور پانچواں مصرع ایک شعر کی صورت میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ اصل متن یوں ہے:

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق　　وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

(آب حیات، محمد حسین آزاد، مطبع مفید عام، لاہور ۱۸۸۷ء، ص ۲۶۹)

آغا حشر کاشمیری کا شعر یوں ہے:

مئے رنگیں تھا سادہ پانی بھی　　ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

(انتخاب کلام آغا حشر کاشمیری، مرتبہ آغا جمیل کاشمیری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۹۱ء، ص ۴۸)

اسیر پنجۂ عہد شباب کرکے مجھے　　کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

مضطرؔ خیر آبادی کا ہی شعر ہے۔ (خرمن (جلد اول)، مضطرؔ خیر آبادی، ناشر: جاوید اختر، ۲۰۱۵ء، ص ۸۶) لیکن غلط درج ہے۔ شاید طباعت کی غلطی ہو۔ مضطر خیر آبادی کی اسی غزل کا پانچواں شعر ہے:

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت　　کریم تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے

جسے حنیف نقوی (مرحوم) نے آغا حشر کاشمیری کا لکھا ہے جو غلط ہے۔ شعر کا متن بھی غلط درج ہے۔

آغا حشر کاشمیری کے اس شعر کے پہلے مصرعے میں 'تم' کی جگہ 'تجھ' ہونا چاہیے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　　اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

انتخاب کلام آغا حشر کاشمیری، مرتبہ: آغا جمیل کاشمیری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴

عیال و مال نے روکا ہے دم کو آنکھوں میں　　　یہ ٹھگ ہٹیں تو مسافر کو راستہ مل جائے

یہ شعر غلام ہمدانی مصحفیؔ کا نہیں شیخ محمد جان شادؔ لکھنوی کا ہے جو میر تقی میرؔ کے فرزند میر کلو عرشؔ کے شاگرد تھے۔ (دیوان شاد [سخن بے مثال]، تصویر عالم پریس، لکھنو، جنوری ۱۹۰۱ء، ص ۱۱۴)

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے　　　منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

فیض احمد فیضؔ کا شعر ہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو لاہور جیل میں کہی گئی یہ غزل فیضؔ کے مجموعۂ کلام 'دست تہ سنگ' میں شامل ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں 'اٹھا' کے جگہ 'بپا' لکھا ہوا ہے۔ (نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیضؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۴)

بیتابیاں سمیٹ کے سارے جہان کی　　　جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

محمد شمس الحق صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ شعر احسان دانش کے ایک شاگرد سید عالم کاظمی نجمیؔ نگینوی کا ہے۔ ۱۷/ جون ۱۹۲۷ء کو ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ رسالہ 'عالمگیر' لاہور کے آخری دور کے مدیر بھی رہے۔ (اردو کے ضرب المثل اشعار تحقیق کی روشنی میں، محمد شمس الحق، ادارۂ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۳، ص ۱۲۵/ گل ہائے رنگ رنگ (جلد دوم)، مولفہ محمد شمس الحق نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۵، ص ۶۲۱)

ادھر جشن ریختہ کی وجہ سے بہت مصروف ہوں۔ آپ نے جن اشعار کے بارے میں دریافت کیا ہے، ان کے بارے میں جشنِ ریختہ کے بعد تفصیل سے لکھوں گا۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

خیر اندیش

وکاس گپتا/ ۱۵/ نومبر/ ۲۰۱۸ء

حواشی:

۱۔ مکتوب نگار نے یہ خط خلیق الزماں نصرتؔ کو اس وقت لکھا جب انھوں نے 'نصرت: فن اور شخصیت' مرتبہ نسیم سحران کو برائے تبصرہ ارسال کی۔ اس میں خلیق الزماں نصرت کے نام ۱۲/ مشاہیر اردو کے خطوط شامل ہیں۔ (مدیر)

۲۔ یہاں دو خطوط ندا فاضلی اور پروفیسر حنیف نقوی کے ہیں۔ (مدیر)

☆☆☆

Vikas Gupta
Editorial Board, Rekhta Foundation,
B-37, Sector-1, Noida -201301,
Mobile : +91-8750 83 85 84
Email : vikas.gupta_786@yahoo.com

قند مکرر

مثنوی مسافر

(علامہ اقبالؔ کے چندروزہ سفر افغانستان کی یادگار)

علامہ محمد اقبال لاہوری

مقدمہ و پیش کش

فیضان حیدر

مقدمہ

علامہ اقبالؔ ان عظیم اور آفاقی شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اپنی قومی اور ملّی شاعری کے ذریعہ نہ صرف فارسی اور اردو کی ادبی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی بلکہ شاعری میں فکری سطح پر نئے تجربات کے ذریعہ عالمی ادب میں بھی اپنا نام محفوظ کرلیا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ فارسی یا اردو کے صاحب طرز شعرا کی فہرست مرتب کی جائے اور اقبال کو فراموش کردیا جائے۔

وہ ایک عظیم شاعر اور علم وفضل میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ بہترین سیاسی رہنما، دانشور اور مفکر بھی تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں ایک مکمل دور کی تاریخ بیان کردی ہے۔ ایسے دور میں جہاں قوتِ فکروعمل کا فقدان تھا، اقبالؔ نے قومی انحطاط کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور فکروعمل میں بہ یک وقت تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اپنے خیالات کو ایک منظم فلسفے کی صورت میں پیش کیا اور ملت کی خوابیدہ روح کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھیں حرکت وعمل کی دعوت دی اور ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ساتھ ہی فارسی شاعری کو روایتی مضامین کی تنگنائے سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ ان کی شاعری کی بنیاد قومیت، ملیت اور دین داری پر ہے اور اس کے محرک بھی یہی رجحانات ہیں۔ قومی، ملی اور دینی احساسات ان کے ذاتی تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انھیں بجا طور پر مفکر ملت اسلامیہ، ترجمان حقیقت، حکیم الامت اور شاعر مشرق کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی عظمت اور قادرالکلامی کا اعتراف خود ایرانی علما وفضلا نے بھی کیا ہے۔ ملک الشعرا بہارؔ مشہدی جو ایک بہترین شاعر، محقق، صحافی اور سیاسی رہنما بھی تھے، علامہ اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

هیکلی گشت از سخن گویان به پا — گفت: کل الصید فی جوف الفرا
قرن حاضر خاصۂ اقبال گشت — واحدی کز صدهزاران برگذشت
شاعران گشتند جیشی تار و مار — وین مبارز کرد کار صد سوار

علامہ اقبالؔ نے ۱۹۳۳ء میں محمد نادر شاہ (بادشاہ افغانستان) کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا اور اس سفر سے متعلق اپنے تجربات ومشاہدات کو شعری قالب عطا کیا۔ سفر سے واپسی کے تقریباً ایک سال بعد ۱۹۳۴ء میں انھوں نے یہ اشعار 'مثنوی مسافر' کے نام سے شائع کیے۔ بعد کو یہ مثنوی 'مثنوی پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق' کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

محمد نادر شاہ (حک: ۱۹۲۹-۱۹۳۳ء) سے قبل امان اللہ (حک: ۱۹۲۶-۱۹۲۹ء) کے دورِ حکومت تک افغانستان میں قدیم نصاب تعلیم رائج تھا۔ جب نادر شاہ کے اقبال نے یاوری کی تو افغانستان کی عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آگئی۔ نادر شاہ نے برسر اقتدار آتے ہی نصاب تعلیم میں تبدیلی کی اشد ضرورت محسوس کی اور ماہرین تعلیم وسیاست سے مشورے کے لیے متعدد سربرآوردہ شخصیتوں کو افغانستان دعوت دی۔ اس نے نظام تعلیم کو بہتر اور موثر بنانے کے لیے علامہ اقبال کو ایک فلسفی اور ادیب، سر راس مسعود کو تعلیم و تربیت میں مہارت اور سید سلیمان ندوی کو تاریخ میں مہارت کی وجہ سے افغانستان آنے کی دعوت دی۔

چنانچہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۳ء میں سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے ساتھ افغانستان کا سفر کیا۔ یہ علامہ کا پہلا افغانستان کا سفر تھا۔ اس دوران انھوں نے کابل، غزنی اور قندھار وغیرہ کی زیارت کی اور سنائی غزنوی اور سلطان محمود کے مزار پر اشک ریزی بھی کی۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے مقبرے پر حاضر ہوئے اور اس کے لیے دعائے خیر کی۔ اس سفر میں اقبال نے علمی اور سیاسی مسائل، مختلف سطحوں کے تعلیمی نظام اور افغانیوں کی قبائلی زندگی کا بغور جائزہ لیا اور انھیں بہتر بنانے کے لیے مفید اور کارآمد مشورے دیے۔

علامہ اقبال کے نادر شاہ سے مراسم اس وقت سے تھے جب وہ یورپ میں مشغول تعلیم تھے اور محمد نادر پیرس میں سفیر افغانستان کی حیثیت سے مقیم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان مکاتبے و مراسلے کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اقبالؔ سید جمال الدین افغانی، حکیم سنائی اور مولانا روم سے بہت متاثر تھے، اسی لیے افغانستان سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس سفر سے متعلق اپنے جذبات واحساسات کو شعری قالب بخشا اور افغانستان کے جن جن مقامات کی زیارت کی ان کی اپنے اشعار میں توصیف کی۔ جب وہ ان مقامات میں وارد ہوتے تو ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اشعار کی صورت اختیار کر جاتی تھی۔

انھوں نے اس مثنوی میں مسلمانوں کی تاریخ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ عبرت انگیز ہے۔ وہ خودی کے قائل ہیں اور یہی وہ عنصر ہے جو فقیری میں بھی شہنشاہی کے اسرار ورموز سے واقف کراتا ہے۔ انھوں نے نئی نسل میں ایک انقلابی روح پھونک دی اور اسلامی عظمت کو اجاگر کیا۔ لسانی یا شعری علامتوں اور واقعات کی

منطقی ترتیب نے اس مثنوی میں ایک خاص وزن پیدا کر دیا ہے جو ایک مختلف طرز مطالعہ کا متقاضی ہے۔

اس کے مطالعے سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو اپنی ذات اور خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے انفرادی مسائل و مصائب کے گرداب سے نکال کر قوم، معاشرہ اور خصوصاً مسلمانوں کی ترقی، خوشحالی اور دینی و دنیوی فلاح و بہبود کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے پیچیدہ مسائل اور فلسفیانہ موشگافیوں کو الفاظ کا خوبصورت پیکر عطا کیا اور اسے روح پرور اشعار کے سانچے میں ڈھال کر قوم وملت کے مسائل کا ترجمان بنایا۔ جب وہ ملت کی بات کرتے ہیں تو نظریاتی اور روحانی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور قوم وملت کی کامرانی کو بنی نوع انسان کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اس مثنوی کی تمہید میں اقبال نے نادر خان کی شخصیت اور سیرت پر روشنی ڈالی ہے اور اس میں پائی جانے والی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔اس سلسلے میں تین اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

نادر افغان شه درویش خو   رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او

کار ملت محکم از تدبیر او   حافظِ دین مبین، شمشیر او

چون ابوذر خود گداز اندر نماز   ضربتش ہنگام کین خارا گداز!

اس کے بعد افغانی نوجوانوں سے خطاب کیا گیا ہے اور انھیں قرآن اور علوم قرآن کے مطالعے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں سربلندی صرف اور صرف قرآن اور اسلام کی راہ پر چل کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے جو آخرت میں بھی سربلندی اور کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہے۔وہ کہتے ہیں:

ای ز خود پوشیدہ خود را بازیاب   در مسلمانی حرامست این حجاب

رمز دین مصطفی دانی کہ چیست   فاش دیدن خویش را شاہنشی ست

چیست دین؟ دریافتن اسرار خویش   زندگی مرگ است بی دیدار خویش

آن مسلمانی کہ بیند خویش را   از جہانی برگزیند خویش را

از ضمیر کائنات آگاہ اوست   تیغ لا موجود الا اللہ اوست

ان اشعار کے مطالعے سے ان کی آفاقیت اور دیدہ وری کا اندازہ ہوتا ہے۔مذکورہ اشعار ان کے فلسفی اور مفکر ہونے پر دال ہیں۔ان میں بے انتہا آمد کا احساس ہوتا ہے۔جذبات کی شدّت اشعار کو موثر بنانے کے ساتھ حد درجہ پرشکوہ بھی بنا دیتی ہے۔طرز ادا اتنا پُرجوش ہے کہ مطالعہ کے وقت قاری پر وارفتگی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ غور وفکر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

علامہ اقبالؔ اپنی تحریروں، تقریروں اور اشعار میں افغانستان کے مسائل پر اکثر گفتگو کرتے

تھے۔جب وہ افغانستان پہنچے تو وہاں حکومت کے ذمے داروں نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ نادر خان کے وزیر سردار احمد شاہ خان نے ان کی مہمان نوازی کی ذمہ داری قبول کی اور انھیں کابل کے آثار قدیمہ کی سیاحت کے لیے لے گئے۔اس دوران اقبالؔ نے وہاں کے کئی تاریخی مقامات کی زیارت کی۔اس کے بعد غزنی کی راہ لی اور ملک سنائی کی طرف قدم رنجہ ہوئے۔غزنی کے بعد قندہار کی طرف کوچ کیا اور اسے اس مثنوی میں 'کشور مینو سواد' کے نام سے یاد کیا ہے۔جب وہ قندہار میں وارد ہوئے تو وہاں کے مناظر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کہتے ہیں:

قندہار آن کشور مینو سواد   اہل دل را خاک او خاک مراد

رنگ ہا، بوہا، ہواہا، آب ہا   آب ہا تابندہ چون سیماب ہا

لالہ ہا در خلوت کہسار ہا   نارہا یخ بستہ اندر نارہا

اس مثنوی میں انھوں نے 'مرد شوریدہ' کے پردے میں مسلمانوں کی حالت زار پر ماتم کیا ہے اور خدا سے یہ دعا کی ہے کہ ان کے دلوں میں پھر عشق رسول (ص) کا جذبہ پیدا کردے، تاکہ وہ دنیا میں دوبارہ سربلند ہوسکیں۔آخری حصے میں ظاہر شاہ سے خطاب کیا ہے اور اسے رموز سلطانی سے آگاہ کیا ہے۔

ان کی اس مثنوی میں جو حسن اور توانائی موجود ہے وہ اسلامی تعلیمات سے براہ راست استفادے سے عبارت ہے۔اقبال کا تخیل آزادی کی راہ پر گامزن تھا اور وہ اسے ہر مرد مومن کا مقصود سمجھتے تھے۔اس مثنوی میں انھوں نے اسلامی تعلیمات اور قرآنی آیات سے اخذ کردہ تلمیحات و استعارات سے بخوبی استفادہ کیا ہے جس سے ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ منفرد ہونے کے ساتھ استدلالی بھی ہوگیا ہے۔

اس کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مولانا روم، شیخ فریدالدین عطارؔ اور سنائیؔ سے بہت متاثر ہیں۔ یہ انھیں حضرات کی شخصیت کا فیضان تھا کہ ان کے ذوق شاعری کی پرورش ہوئی اور ان کے ذہن و دماغ کے دریچے وا ہوئے۔اس کے باوجود ان کے یہاں ایک منفرد طرز ادا کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس نے ان کی مثنوی میں نئی کیفیت اور معنویت پیدا کردی ہے۔ پیغام رسانی کے زیر سایہ انھوں نے اپنی زبان کو کہیں سے لوچ نہیں آنے دیا بلکہ ابلاغ کے ساتھ فن شاعری کے رموز کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔

اس مثنوی کی ایک بڑی خصوصیت ان کا بے باکانہ، پرزور اور انقلابی لب ولہجہ ہے جو قارئین کو عمل پیہم و جہد مسلسل کے لیے برانگیختہ کرتا ہے اور ان کے قلب و دماغ کو مسخر کرلیتا ہے۔اس میں عشق، وارفتگی، حریم، سلطانی، فقیری، خط تقدیر، دیر مغان، ظلام شب اور عروس ہزار داماد وغیرہ معمولی مفاہیم و معانی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ استعارات و کنایات ہیں جو ہمیں اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی پر

آمادہ کرتے ہیں۔

داغ دہلوی کی شاگردی کے باوجود وہ ان کے تغزّل سے قطعاً متاثر نہیں تھے۔ ان کی نظر ہمیشہ قومی، ملی اور عوامی مسائل پر رہی۔ وہ مسلمانوں کے معاشرتی اور اخلاقی زوال کو اسلامی روایات سے دور ہونا خیال کرتے تھے۔ ان کے یہاں اسلامی روایات کا گہرا شعور ملتا ہے ساتھ ہی جدید روایات کی پاسداری بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

ان کا تفکر و تخیل اسلامی روایات کے گہرے شعور سے مستعار ہے۔ اسی شعور نے اس مثنوی کے اشعار میں حرارت اور زندگی کی گرمی پیدا کر دی ہے جس کا تتبع آج تک کسی شاعر سے بن نہیں پڑا۔ اس راہ پر سبھی تھوڑی دور چل کر اپنی عاجزی اور درماندگی ظاہر کرتے ہیں جو خود ان کے ایک عظیم اور آفاقی شاعر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

مثنوی مسافر وقتی حالات اور عصری حقائق کی بہترین ترجمان ہے۔ اس میں اثر آفرینی اور لطف اندوزی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بار بار پڑھنے سے بھی دل نشینی اور کیف میں کمی نہیں آتی اور اثر آفرینی بھی برقرار رہتی ہے۔ چونکہ یہ علامہ کے آخری ایام کا کلام ہے اس لیے اس میں حکیمانہ رنگ غالب ہے۔ یہ مثنوی ہمارے ماضی کا قیمتی اثاثہ ہونے کے ساتھ مستقبل کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

(فیضان حیدر)

پیش لفظ

(چاپ ۱۹۶۸م)

در سالِ ۱۹۲۹م مطابق با ۱۳۰۸ ہجری شمسی افغانستان مواجہ شد با یک شورش بزرگ داخلی۔ مردکہ ای حبیب اللہ نام کہ خودش بچہ سقاوی بود، این مملکتِ خداداد اسلامیہ را چپاول کردہ، امیر امان اللہ خان فقید را وادار ساخت از تخت و تاج و وطن دست بکشد و خودش را پادشاہ افغانستان و حامی دین اسلام اعلان نمود، تا این کہ نُہ ماہ بعد در ماہ نوامبر ہمان سال سردار محمد نادر خان و برادران با عزم و ہمت شان آن وطن عزیز را نجات دادند۔

این وضعیت پُر آشوب و وخیم افغانستان موجبات نگرانی و تشویش مسلمانان شبہ قارۂ پاکستان و ہند را نیز فراہم آورد و از روی مناسبات ہم کیشی و ہم جواری کہ با برادران افغانی داشتہ و دارند ہر گونہ وسایل مادی و جانی و روحانی خویش را بہ سردار موصوف تقدیم نمودند، طوری کہ می گویند وقتی کہ سردار محمد نادر خان بہ عزم نجات وطن از فرانسہ بہ ہند وارد، و ترن (قطار) شان در ایستگاہ لاہور در پاکستان رسید، خود علامہ دکتور محمد اقبال برای پذیرایی شان حاضر و کل دارایی خویش را بہ آن جناب پیش کش نمودہ، فرمودند: ''بی نوایم ہمین دارم در راہ استقلال و نجات افغانستان، پذیرفتہ شود۔'' این جذبۂ ایثار و عشق مفرطی کہ حکیم مشرق برای ملت افغان ابراز نمود، سردار موصوف را خیلی متاثر کرد۔ و حق این است کہ علامہ اقبال برای افغان ہا از احمد شاہ ابدالی تا امیر امان اللہ خان حسیات محبت و اخوت بہ فراوانی داشت و بہ دل خویش انتظاری داشت۔ از روزی کہ افغان ہا بہ حیث یک قلۂ آزاد و سلحشور ملت اسلامیہ برای استقلال مسلمانان شبہ قارہ نیز سہیم شوند و نیز پیغام عشق نبی (ص) را در قہستان تازہ کنند۔ چنانچہ در پیام مشرق (۱۹۲۳م) در خطابہ ای با اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان فرمودند:

دیدہ ای ای خسرو کیوان جناب — آفتاب ما توارت بالحجاب

ابطحی در دشت خویش از راہ رفت — از دم او سوز الا اللہ رفت

مصریان افتادہ در گرداب نیل — سست رگ تورانیان ژندہ پیل

آل عثمان در شکنج روزگار   مشرق و مغرب ز خونش لاله زار
عشق را آئین سلمانی نماند   خاک ایران ماند و ایرانی نماند
مسلم ہندی شکم را بندہ‌ای   خود فروشی دل ز دین برکندہ‌ای
ای ترا فطرت ضمیر پاک داد   از غم دین، سینۂ صد چاک داد
تازہ کن آئین صدیق و عمر   چون صبا بر لالۂ صحرا گذر
تا ز صدیقان این امت شوی   بہر دین سرمایۂ قوت شوی

ہمین کہ اعلی حضرت محمد نادر شاہ از سرکوبی عناصر خاین و وطن دشمن فراغت یافتہ، توجۂ خویش را بہ امور اصلاح و تعمیر و انکشاف وطن مبذول داشتند و در این اولین فرصت بنابر اہمیتی کہ بہ معارف حاصل است از علامہ اقبال خواہش نمودند بہ کابل تشریف بردہ حکومت و عمال شان را مشورت و رہنمونی کنند۔

در این ضمن علامہ سید سلیمان ندوی در کتاب خود عنوانی 'سیر افغانستان' نگاشتہ اند: (در اواخر سال ۱۹۳۳م) مراسلہ ای از طرف دکتور سر محمد اقبال رسید، کہ طی آن گفتند کہ حکومت افغانستان خود دکتور صاحب و سر راس مسعود و این جانب را بہ کابل دعوت نمودہ است تا در امور معارف با ما مشورت نمایند۔ آیا من حاضرم بروم؟ در پاسخ گفتم "آری برای ہر خدمتی کہ بہ افغانستان از من بیاید حاضرم!" علامہ اقبال بہ تاریخ ۲۲/ اکتوبر بہ کابل وارد و تا دوم نوامبر در افغانستان ماندہ دو یا سہ روز بعد از راہ غزنی و قندہار چمن بہ خانۂ خود در لاہور مراجعت فرمودند۔ اندکی نگذشتہ بود کہ خبر شہادت اعلیٰ حضرت نادر شاہ بہ گوش جہانیان رسیدہ، دوستان را رنجیدہ ساخت۔

دوران قیام شان در کابل بین حکومت و این نابغۂ علم و فن چہ ہا گذشت احوالش بہ طور رسمی در دست نیست ولی کیف و کم آن را می توان از مثنوی علامہ عنوانی 'مسافر' تقدیر و تمجید کرد۔ بالخصوص از ابیاتی کہ در آغاز کتاب در مناقب شاہ شہید و خطابہ ای کہ در پایان آن بہ اعلی حضرت محمد ظاہر شاہ پادشاہ جوان سال افغانستان ایراد نمودہ۔

اینک افتخار من است این کتاب را بہ طرز نوین بہ دست خوانندگان گرامی افغانستان از طرف حکومت اسلامیہ پاکستان اہدا نمایم۔ در خاتمہ موقع را مغتنم شمردہ از آقای دکتور جاوید اقبال خلف علامہ فقید و خواہر محترمہ اش منیرہ بیگم صلاح الدین احساسات امتنان خویش را ابراز دارم از این کہ اجازہ چاپ این کتاب را دادہ اند۔

والسلام

الطاف گوہر

معین وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان،

راول پنڈی، اسلام آباد- ۱۹۶۸م

آغاز

نادر افغان شہ درویش خو   رحمت حق بر روان پاک او
کار ملت محکم از تدبیر او   حافظ دین مبین شمشیر او
چون ابوذر خود گداز اندر نماز   ضربتش ہنگام کین خارا گداز!
عہد صدیق از جمالش تازہ شد   عہد فاروق از جلالش تازہ شد!
از غم دین در دلش چون لالہ داغ   در شب خاور وجود او چراغ!
در نگاہش مستی ارباب ذوق   جوہر جانش سراپا جذب و شوق
خسروی شمشیر و درویشی نگہ   ہر دو گوہر از محیط لاالہ
فقر و شاہی واردات مصطفیٰ ست!   این تجلی ہای ذات مصطفیٰ ست!
این دو قوت از وجود مومن است   این قیام و آن سجود مومن است
فقر، سوز و درد و داغ و آرزوست   فقر را در خون تپیدن آبروست
فقرِ نادر آخر اندر خون تپید   آفرین بر فقر آن مرد شہید!
ای صبا ای رہ‌نورد تیزگام   در طواف مرقدش نرمک خرام
شاہ در خواب است پا آہستہ نہ   غنچہ را آہستہ‌تر بگشا گرہ
از حضور او مرا فرمان رسید   آن کہ جان تازہ در خاکم دمید

....

سوختیم از گرمیِ آواز تو   ای خوش آن قومی کہ داند راز تو
از غم تو ملت ما آشناست   می‌شناسیم این نواہا از کجاست
ای بہ آغوش سحاب ما چو برق   روشن و تابندہ از نور تو شرق
یک زمان در کوہسار ما درخش   عشق را باز آن تب و تابی ببخش

تا کجا در بندہا باشی اسیر
تو کلیمی راہ سینایی بگیر

....

طی نمودم باغ و راغ و دشت و در
چون صبا بگذشتم از کوہ و کمر

خیبر از مردان حق بیگانہ نیست
در دل او صد ہزار افسانہ ایست!

جادہ کم دیدم ازو پیچیدہ‌تر
یاوہ گردد در خم و پیچش نظر

سبزہ در دامان کہسارش مجوی
از ضمیرش بر نیاید رنگ و بوی

سرزمینی کبک او شاہین مزاج
آہوی او گیرد از شیران خراج!

در فضایش جرّہ بازان تیز چنگ
لرزہ بر تن از نہیب شان پلنگ!

لیکن از بی‌مرکزی آشفتہ روز
بی‌نظام و ناتمام و نیم سوز!

فر بازان نیست در پرواز شان
از تدروان پست‌تر پرواز شان!

آہ قومی بی‌تب‌وتاب حیات
روزگارش بی‌نصیب از واردات!

آن یکی اندر سجود، این در قیام
کاروبارش چون صلوات بی‌امام!

ریز ریز از سنگ او مینای او
آہ! از امروز بی‌فردای او!

خطاب بہ اقوام سرحد

ای ز خود پوشیدہ خود را بازیاب
در مسلمانی حرامست این حجاب

رمزِ دین مصطفیؐ دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شاہنشہی ست

چیست دین؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بی دیدارِ خویش

آن مسلمانی کہ بیند خویش را
از جہانی برگزیند خویش را

از ضمیر کائنات آگاہ اوست
تیغ لا موجود الا اللہ اوست

در مکان و لامکان غوغای او
نہ سپہر آوارہ در پہنای او

تا دلش سرّی ز اسرارِ خداست
حیف اگر از خویشتن ناآشناست

بندۂ حق وارثِ پیغمبران
او نگنجد در جہانِ دیگران

تا جہانی دیگری پیدا کند
این جہانِ کہنہ را برہم زند

زندہ مرد از غیر حق دارد فراغ
از خودی اندر وجود او چراغ

پای او محکم بہ رزم خیر و شر
ذکر او شمشیر و فکر او سپر

صبحش از بانگی کہ برخیزد ز جان
نی ز نورِ آفتابِ خاوران

فطرت او بی‌جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

ذرہ‌ای از گرد راہش آفتاب
شاہد آمد بر عروج او کتاب

فطرت او را گشاد از ملت است
چشمِ او روشن سواد از ملت است

اندکی گم شو بہ قرآن و خبر
باز ای نادان بہ‌خویش اندر نگر

در جہان آوارہ‌ای بیچارہ‌ای
وحدتی گم کردہ‌ای صد پارہ‌ای

بندِ غیرُ اللہ اندر پایِ تست
داغم از داغی کہ در سیمایِ تست

میر خیل! از مکر پنہانی بترس
از ضیاعِ روحِ افغانی بترس

ز آتش مردانِ حق می‌سوزمت
نکتہ‌ای از پیر روم آموزمت

رزق از حق جو، مجو از زید و عَمرو
مستی از حق جو، مجو از بنگ و خمر

گل مخر گل را مخور گل را مجو
زانکہ گل خوار است دایم زرد رو

دل بجو تا جاودان باشی جوان
از تجلی چہرہ‌ات چون ارغوان

بندہ باش و بر زمین رَو چون سمند
چون جنازہ نی کہ بر گردن برند

....

شکوہ کم کن از سپہر لاجورد
جز بہ گرد آفتاب خود مگرد

از مقام ذوق و شوق آگاہ شو
ذرہ‌ای؟ صیاد مہر و ماہ شو

عالم موجود را اندازہ کن
در جہان خود را بلند آوازہ کن

برگ و ساز کاینات از وحدت است
اندرین عالم، حیات از وحدت است

درگذر از رنگ و بوہای کہن
پاک شو از آرزوہای کہن

این کہن سامان نیرزد با دو جو
نقشبندِ آرزوی تازہ شو

زندگی بر آرزو دارد اساس
خویش را از آرزوی خود شناس

چشم و گوش و ہوش، تیز از آرزو
مشت خاکی لالہ خیز از آرزو

ہر کہ تخمِ آرزو در دل نکِشت
پایمال دیگران چون سنگ وخشت

آرزو سرمایۂ سلطان و میر
آرزو جام جہان بین فقیر

آب و گل را آرزو آدم کند
آرزو ما را ز خود محرم کند

چون شرر از خاک ما بر می‌جہد
ذرہ را پہنای گردون می‌دہد

پورِ آزر کعبہ را تعمیر کرد
از نگاہی خاک را اکسیر کرد

تو خودی اندر بدن تعمیر کن
مشتِ خاکِ خویش را اکسیر کن

مسافر وارد می شود بہ شہر کابل و حاضر می شود بہ حضورِ اعلیٰحضرت شہید

شہرِ کابل! خطۂ جنت نظیر
آبِ حیوان از رگِ تاکش بگیر

چشمِ صائب (۱) از سوادش سرمہ چین
روشن و پایندہ باد آن سرزمین

در ظلامِ شب سمن زارش نگر
بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر

آن دیارِ خوش سواد، آن پاک بوم
بادِ او خوشتر ز بادِ شام و روم

آبِ او براق و خاکش تابناک
زندہ از موجِ نسیمش، مردہ خاک

ناید اندر حرف و صوت اسرارِ او
آفتابان خفتہ در کہسارِ او

ساکنانش سیر چشم و خوش گہر
مثلِ تیغ از جوہرِ خود بی خبر

قصرِ سلطانی کہ نامش دلگشاست
زائران را گردِ راہش کیمیاست

شاہ را دیدم درآن کاخ بلند
پیشِ سلطانی فقیری دردمند

خلقِ او اقلیمِ دلہا را گشود
رسم و آیینِ ملوک آنجا نبود

من حضورِ آن شہِ والا گہر
بی نوا مردی بہ دربارِ عمر

جانم از سوزِ کلامش در گداز
دست او بوسیدم از راہِ نیاز

پادشاہی خوش کلام و سادہ پوش
سخت کوش و نرم خوی و گرم جوش

صدق و اخلاص از نگاہش آشکار
دین و دولت از وجودش استوار

خاکی و از نوریان پاکیزہ تر
از مقامِ فقر و شاہی باخبر

در نگاہش روزگارِ شرق و غرب
حکمت او رازدارِ شرق و غرب

شہریاری چون حکیمان نکتہ دان
رازدانِ مد و جزرِ امتان

پردہ ہا از طلعتِ معنی گشود
نکتہ ہای ملک و دین را وانمود

گفت: از ان آتش کہ داری در بدن
من ترا دانم عزیزِ خویشتن

ہرکہ او را از محبت رنگ و بوست
در نگاہم ہاشم و محمود اوست

در حضورِ آن مسلمانِ کریم
ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم

گفتمش این سرمایۂ اہلِ حق است
در ضمیرِ او حیاتِ مطلق است

اندرو ہر ابتدا را انتہا است
حیدر از نیروی او خیبر گشاست

نشۂ حرفم بہ خون او دوید
دانہ دانہ اشک از چشمش چکید

گفت "نادر در جہان بیچارہ بود
از غمِ دین و وطن آوارہ بود

کوہ و دشت از اضطرابم بی خبر
از غمانِ بی حسابم بی خبر

نالہ با بانگِ ہزار آمیختم
اشک با جوی بہار آمیختم

غیرِ قرآن غمگسارِ من نبود
قوتش ہر باب را بر من گشود"

گفتگوی خسروِ والا نژاد
باز با من جذبۂ سرشار داد

وقتِ عصر آمد صدای الصلوٰت
آن کہ مومن را کند پاک از جہات

انتہای عاشقان سوز و گداز
کردم اندر اقتدای او نماز

رازہای آن قیام و آن سجود
جز بہ بزمِ محرمان نتوان گشود

بر مزارِ شہنشاہ بابر خلد آشیانی

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است
درون پردۂ او نغمہ نیست فریاد است

زمانہ کہنہ بتان را ہزار بار آراست
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

درفشِ ملتِ عثمانیان دوبارہ بلند
چہ گویمت کہ بہ تیموریان چہ افتاد است

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید این جا
کہ این زمین ز طلسمِ فرنگ آزاد است

ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دہلی ست
کہ آن عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

درون دیدہ نگہ دارم اشکِ خونین را
کہ من فقیرم و این دولتِ خداداد است

اگرچہ پیرِ حرم وردِ لاالہ دارد
کجا نگاہ کہ برندہ تر ز پولاد است

سفر بہ غزنی و زیارتِ مزارِ حکیم سنائی

از نوازش ہای سلطانِ شہید
صبح و شامم، صبح و شامِ روزِ عید

نکتہ سنجِ خاوران ہندی فقیر
میہمانِ خسروِ کیوان سریر

تا ز شہرِ خسروی کردم سفر
شد سفر بر من سبک تر از حضر

سینہ بگشادم بہ آن بادی کہ پار
لالہ رست از فیضِ او در کوہسار

آہ! غزنی آن حریم علم و فن   مرغزار شیر مردان کہن
دولت محمود را زیبا عروس   از حنا بندان او دانای طوس
خفتہ در خاکش حکیم غزنوی   از نوای او دل مردان قوی
آن حکیم غیب، آن صاحب مقام   'ترک جوش' رومی از ذکرش تمام
من ز 'پیدا' او ز 'پنہان' در سرور   ہر دو را سرمایہ از ذوق حضور
او نقاب از چہرۂ ایمان گشود   فکر من تقدیر مومن وانمود
ہر دو را از حکمت قرآن سبق   او ز حق گوید، من از مردان حق
در فضای مرقد او سوختم   تا متاع نالہ‌ای اندوختم
گفتم ای بینندۂ اسرار جان   بر تو روشن این جہان و آن جہان
عصر ما وارفتۂ آب و گل است   اہل حق را مشکل اندر مشکل است
مومن از افرنگیان دید آن چہ دید   فتنہ‌ہا اندر حرم آمد پدید
تا نگاہ او ادب از دل نخورد   چشم او را جلوۂ افرنگ برد
ای حکیم غیب، امام عارفان   پختہ از فیض تو خام عارفان
آن چہ اندر پردۂ غیب است گوی   بہ کہ آب رفتہ باز آید بجوی

روح حکیم سنائی از بہشت برین جواب می دہد

رازدان خیر و شر گشتم ز فقر   زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر
یعنی آن فقری کہ داند راہ را   بیند از نور خودی اللہ را
اندرون خویش جوید لاالہ   در تہِ شمشیر گوید لاالہ
فکر جان کن چون زنان بر تن متن   ہمچو مردان گوی در میدان فکن
سلطنت اندر جہان آب و گل   قیمت او قطرہ‌ای از خون دل
مومنان زیر سپہر لاجورد   زندہ از عشق‌اند و نی از خواب و خورد
می ندانی، عشق و مستی از کجاست؟   این شعاع آفتاب مصطفی است
زندہ‌ای تا سوز او در جان تست   این نگہ‌دارندۂ ایمان تست
با خبر شو از رموز آب و گل   پس بزن بر آب و گل اکسیر دل

دل ز دین سرچشمۂ ہر قوت است   دین ہمہ از معجزات صحبت است
دین مجو اندر کتب ای بی‌خبر   علم و حکمت از کتب، دین از نظر
بوعلی دانندۂ آب و گل است   بی‌خبر از خستگی‌ہای دل است
نیش و نوش بوعلی سینا بہل   چارہ سازی‌ہای دل از اہل دل
مصطفی بحر است و موج او بلند   خیز و این دریا بجوی خویش بند
مدتی بر ساحلش پیچیدہ‌ای   لطمہ‌ہای موج او نادیدہ‌ای
یک زمان خود را بہ دریا در فکن   تا روان رفتہ باز آید بہ تن
ای مسلمان جز بہ راہِ حق مرو   ناامید از رحمت عامی مشو
پردہ بگذار آشکارایی گزین   تا بلرزد از سجود تو زمین
دوش دیدم فطرت بی‌تاب را   روح آن ہنگامۂ اسباب را
چشم او بر زشت و خوب کاینات   در نگاہ او غیوب کاینات
دست او با آب و خاک اندر ستیز   آن بہم پیوستہ و این ریز ریز
گفتمش در جستجوی کیستی؟   در تلاش تار و پوی کیستی؟
گفت از حکم خدای ذوالمنن   آدمی نو سازم از خاک کہن
مشت خاکی را بہ صد رنگ آزمود   پی بہ پی تابید و سنجید و فزود
آخر او را آب و رنگ لالہ داد   لاالہ اندر ضمیر او نہاد
باش تا بینی بہار دیگری   از بہار پاستان رنگین‌تری
ہر زمان تدبیرہا دارد رقیب   تا نگیری از بہار خود نصیب
بر درون شاخ گل دارم نظر   غنچہ‌ہا را دیدہ‌ام اندر سفر
لالہ را در وادی و کوہ و دمن   از دمیدن باز نتوان داشتن
بشنود مردی کہ صاحب جستجوست   نغمہ‌ای را کو ہنوز اندر گلوست

برمزارِ سلطان محمود علیہ الرحمہ

خیزد از دل نالہ‌ہا بی‌اختیار   آہ! آن شہری کہ این جا بود پار
آن دیار و کاخ و کو ویرانہ ایست   آن شکوہ و فال و فر افسانہ ایست

گنبدی، در طوف او چرخ برین
تربت سلطان محمود است این

آن که چون کودک لب از کوثر بشست
گفت در گهواره نام او نخست

برق سوزان، تیغ بی زنہار او
دشت و در لرزنده از یلغار او

زیر گردون آیت اللہ رایتش
قدسیان قرآن سرا بر تربتش

شوخی فکرم مرا از من ربود
تا نبودم در جہان دیر و زود

رخ نمود از سینه ام آن آفتاب
پردگی ہا از فروغش بی حجاب

مہر گردون از جلالش در رکوع
از شعاعش دوش می گردد طلوع

وارہیدم از جہان چشم و گوش
فاش چون امروز دیدم صبح دوش

شہر غزنین یک بہشت رنگ و بو
آب جوہا نغمه خوان در کاخ و کو

قصرہای او قطار اندر قطار
آسمان ہا قبه ہایش ہم کنار

نکته سنج طوس را دیدم به بزم
لشکر محمود را دیدم به رزم

روح سیر عالم اسرار کرد
تا مرا شوریده ای بیدار کرد

آن ہمه مشتاقی و سوز و سرور
در سخن چون رند بی پروا جسور

تخم اشکی اندر آن ویرانه کاشت
گفتگوہا باخدای خویش داشت

تا نبودم بی خبر از راز او
سوختم از گرمی آواز او

مناجاتِ مردِ شوریدہ در ویرانۂ غزنی

لاله بهر یک شعاع آفتاب
دارد اندر شاخ چندین پیچ و تاب

چون بہار او را کند عریان و فاش
گویدش جز یک نفس این جا مباش

ہر دو آمد یک دگر را ساز و برگ
من ندانم زندگی خوش تر که مرگ

زندگی پیہم مصاف نیش و نوش
رنگ و نم امروز را از خون دوش

الامان از مکر ایام الامان
الامان از صبح و از شام الامان

ای خدا! ای نقشبند جان و تن
با تو این شوریده دارد یک سخن

فتنه ہا بینم درین دیر کہن
فتنه ہا در خلوت و در انجمن

عالم از تقدیر تو آمد پدید
یا خدای دیگر او را آفرید

ظاہرش صلح و صفا باطن ستیز
اہل دل را شیشۂ دل ریز ریز

صدق و اخلاص و صفا، باقی نماند
"آن قدح بشکست و آن ساقی نماند"

چشم تو بر لاله رویان فرنگ
آدم از افسونشان بی آب و رنگ

از که گیرد ربط و ضبط این کاینات؟
ای شہید عشوۂ لات و منات

مرد حق آن بندۂ روشن نفس
نایب تو در جہان او بود و بس

او به بند نقره و فرزند و زن
گر توانی، سومنات او شکن

این مسلمان از پرستاران کیست
در گریبانش یکی ہنگامه نیست

سینه اش بی سوز و جانش بی خروش
او سرافیل است و صور او خموش

قلب او نامحکم و جانش نژند
در جہان کالای او نا ارجمند

در مصاف زندگانی بی ثبات
دارد اندر آستین لات و منات

مرگ را چون کافران داند ہلاک
آتش او کم بہا مانند خاک

شعله ای از خاک او باز آفرین
آن طلب آن جستجو باز آفرین

باز جذب اندرون، او را بده
آن جنون ذوفنون، او را بده

شرق را کن از وجودش استوار
صبح فردا از گریبانش برآر

بحر احمر را به چوب او شگاف
از شکوہش لرزه ای افگن به قاف

قندہار و زیارت خرقۂ مبارک

قندہار آن کشور مینو سواد
اہل دل را خاک او خاک مراد

رنگ ہا، بوہا، ہواہا، آب ہا
آب ہا تابنده چون سیماب ہا

لاله ہا در خلوت کہسارہا
نارہا یخ بسته اندر نارہا

کوی آن شہر است مارا کوی دوست
ساربان بر بند محمل سوی دوست

می سرایم دیگر از یاران نجد
از نوایی، ناقه را آرم به وجد

غزل

از دیر مغان آیم بی گردش صہبا مست
در منزل لا بودم از بادۂ الا مست

دانم که نگاہ او ظرف ہمه کس بیند
کرد است مرا ساقی از عشوه و ایما مست

وقت است که بگشایم میخانهٔ رومی باز
پیران حرم دیدم در صحن کلیسا مست

این کار حکیمی نیست، دامان کلیمی گیر
صد بندهٔ ساحل مست، یک بندهٔ دریا مست

دل را به چمن بردم از باد چمن افسرد
میرد به خیابان‌ها این لالهٔ صحرا مست

از حرف دلآویزش اسرار حرم پیدا
دی کافرکی دیدم در وادی بطحا مست

سیناست که فاران است یارب چه مقام است این؟
هر ذرهٔ خاک من چشمی ست تماشا مست

☆☆

خرقهٔ ''آن برزخ لایبغیان''(۲)
دیدمش در نکتهٔ ''لی خرقتان''

دین او آیین او تفسیر کل
در جبین او خط تقدیر کل

عقل را او صاحب اسرار کرد
عشق را او تیغ جوهر دار کرد

کاروان شوق را او منزل است
ما همه یک مشت خاکیم، او دل است

آشکارا دیدنش، اسرای ماست
در ضمیرش مسجد اقصای ماست

آمد از پیراهن او بوی او
داد ما را نعرهٔ الله هو

با دل من شوق بی‌پروا چه کرد؟
بادهٔ پرزور با مینا چه کرد؟

رقصد اندر سینه از زور جنون
تا ز راه دیده می‌آید برون

گفت من جبریلم و نور مبین
پیش ازین او را ندیدم این چنین

شعر رومی خواند و خندید و گریست
یا رب این دیوانهٔ فرزانه کیست؟

در حرم با من سخن زندانه گفت
از می و مغ‌زاده و پیمانه گفت

گفتمش این حرف بی‌باکانه چیست
لب فروبند این مقام خامشی ست

من ز خون خویش پروردم ترا
صاحب آه سحر کردم ترا

بازیاب این نکته را ای نکته‌رس
عشق مردان ضبط احوال است و بس

گفت عقل و هوش آزار دل است
مستی و وارفتگی کار دل است

نعره‌ها زد تا فتاد اندر سجود
شعلهٔ آواز او بود، او نبود

برمزار حضرت احمد شاہ بابا علیہ الرحمہ موسس ملت افغانیہ

تربت آن خسرو روشن ضمیر
از ضمیرش ملتی صورت پذیر

گنبد او را حرم داند سپهر
با فروغ از طوف او سیمای مهر

مثل فاتح(۳) آن امیر صف‌شکن
سکه‌ای زد هم به اقلیم سخن

ملتی را داد ذوق جستجو
قدسیان تسبیح خوان بر خاک او

از دل و دست گهرریزی که داشت
سلطنت‌ها برد و بی‌پروا گذاشت

نکته‌سنج و عارف و شمشیرزن
روح پاکش با من آمد در سخن

گفت می‌دانم مقام تو کجاست
نغمهٔ تو خاکیان را کیمیاست

خشت و سنگ از فیض تو دارای دل
روشن از گفتار تو سینای دل

پیش ما ای آشنای کوی دوست
یک نفس بنشین که داری بوی دوست

ای خوش آن کو از خودی آیینه ساخت
وندر آن آیینه عالم را شناخت

پیر گردید این زمین و این سپهر
ماه کور از کورچشمی‌های مهر

گرمی هنگامه‌ای می‌بایدش
تا نخستین رنگ و بو باز آیدش

بندهٔ مومن سرافیلی کند
بانگ او هر کهنه را برهم زند

ای ترا حق داد جان ناشکیب
تو ز سر ملک و دین داری نصیب

فاش گو با پور نادر فاش گوی
باطن خود را به ظاهر فاش گوی

خطاب بہ پادشاہ اسلام اعلیحضرت ظاہر شاہ، ایدہ اللہ بنصرہ

ای قبای پادشاهی بر تو راست
سایهٔ تو خاک ما را کیمیاست

خسروی را از وجود تو عیار
سطوت تو ملک و دولت را حصار

از تو ای سرمایهٔ فتح و ظفر
تخت احمد شاه را شانی دگر

سینه‌ها بی‌مهر تو ویرانه به
از دل و از آرزو بیگانه به

آب‌گون تیغی که داری در کمر
نیم شب از تاب او گردد سحر

نیک می‌دانم که تیغ نادر است
من چه گویم باطن او ظاهر است

حرف شوق آورده‌ام از من پذیر
از فقیری رمز سلطانی بگیر

ای نگاه تو ز شاهین تیزتر
گرد این ملک خدادادی نگر

این که می‌بینیم از تقدیر کیست؟
چیست آن چیزی که می‌بایست و نیست؟

روز و شب آیینهٔ تدبیر ماست
روز و شب آیینهٔ تقدیر ماست

با تو گویم ای جوان سخت‌کوش
چیست فردا؟ دختر امروز و دوش

هر که خود را صاحب امروز کرد
گرد او گردد سپهر گرد گرد

او جهان رنگ و بو را آبروست
دوش ازو، امروز ازو، فردا ازوست

مرد حق سرمایهٔ روز و شب است
زان که او تقدیر خود را کوکب است

بندهٔ صاحب نظر پیر اُمم
چشم او بینای تقدیر اُمم

از نگاهش تیزتر شمشیر نیست
ما همه نخچیر، او نخچیر نیست

لرزد از اندیشهٔ آن پخته‌کار
حادثات اندر بطون روزگار

چون پدر اہل ہنر را دوست دار
بندهٔ صاحب نظر را دوست دار

ہمچو آن خلد آشیان بیدار زی
سخت کوش و پر دم و کرّار زی

می‌شناسی معنی کرّار چیست؟
این مقامی از مقامات علیؑ است

امتان را در جہان بی‌ثبات
نیست ممکن جز بہ کرّاری حیات

سرگذشت آل عثمان را نگر
از فریب غربیان خونین جگر

تا ز کرّاری نصیبی داشتند
در جہان، دیگر علم افراشتند

مسلم ہندی چرا میدان گذاشت؟
ہمت او بوی کرّاری نداشت

مشت خاکش آن چنان گردیده سرد
گرمی آواز من کاری نکرد

ذکر و فکر نادری در خون تست
قاہری با دلبری در خون تست

ای فروغ دیدهٔ برنا و پیر
سرّ کار از ہاشم و محمود گیر

ہم از آن (۴) مردی کہ اندر کوه و دشت
حق ز تیغ او بلند آوازه گشت

روزہا، شب‌ہا تپیدن می‌توان
عصر دیگر آفریدن می‌توان

صد جہان باقی است در قرآن ہنوز
اندر آیاتش یکی خود را بسوز

باز افغان را از آن سوزی بده
عصر او را صبح نو روزی بده

ملتی گم گشتهٔ کوه و کمر
از جبینش دیده‌ام چیزی دگر

زان کہ بود اندر دل من سوز و درد
حق ز تقدیرش مرا آگاه کرد

کاروبارش را نکو سنجیده‌ام
آن چہ پنہان است پیدا دیده‌ام

مرد میدان زنده از اللہ ہوست
زیر پای او جہان چارسوست

بنده‌ای کو دل بغیراللہ نبست
می‌توان سنگ از زجاج او شکست

او نگنجد در جہان چون و چند
تہمت ساحل بہ این دریا مبند

چون ز روی خویش بر گیرد حجاب
او حسابست، او ثوابست، او عذاب

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است
این دو قوت اعتبار ملت است

آن فتوحات جہان ذوق و شوق
این فتوحات جہان تحت و فوق

ہر دو انعام خدای لایزال
مومنان را آن جمال است این جلال

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذّت ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلمان زاده است
این گہر از دست ما افتاده است

چون عرب اندر اروپا پر گشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آن صحرا نشینان کاشتند
حاصلش افرنگیان برداشتند

این پری از شیشهٔ اسلاف ماست
باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

لیکن از تہذیب لادینی گریز
زان کہ او با اہل حق دارد ستیز

فتنہ‌ہا این فتنہ پرداز آورد
لات و عزیٰ در حرم باز آورد

از فسونش دیدهٔ دل نا بصیر
روح از بی‌آبی او تشنہ میر

لذت بی‌تابی از دل می‌برد
بلکہ دل زین پیکر گل می‌برد

کہنہ دزدی غارت او برملا ست
لالہ می‌نالد کہ داغ من کجاست

حق نصیب تو کند ذوق حضور
باز گویم آن چہ گفتم در زبور (۵)

"مردن و ہم زیستن ای نکتہ رس
این ہمہ از اعتبارات است و بس

مرد کر سوز نوا را مرده‌ای
لذت صوت و صدا را مرده‌ای

پیش چنگی مست و مسرور است کور
پیش رنگی زنده در گور است کور

روح با حق زنده و پاینده است
ورنہ این را مرده، آن را زنده است

آن کہ حی لایموت آمد حق است
زیستن با حق حیات مطلق است

ہر کہ بی‌حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتم او زار نیست"

برخور از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیده‌ام آب حیات

می دہد ما را پیام لاتخف
می رساند بر مقام لاتخف

قوت سلطان و میر از لااله
ہیبت مرد فقیر از لااله

تا دو تیغ لا و الا داشتیم
ماسوی الله را نشان نگذاشتیم

خاوران از شعلۂ من روشن است
ای خنک مردی که در عصر من است

از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازین ناید چو من مرد فقیر

گوہر دریای قرآن سفته ام
شرح رمز صبغۃُ الله گفته ام

با مسلمانان غمی بخشیده ام
کہنه شاخی را نمی بخشیده ام

عشق من از زندگی دارد سراغ
عقل از صہبای من روشن ایاغ

نکته ہای خاطر افروزی که گفت؟
با مسلمان حرف پرسوزی که گفت؟

ہمچو نی نالیدم اندر کوه و دشت
تا مقام خویش بر من فاش گشت

حرف شوق آموختم وا سوختم
آتش افسرده باز افروختم

با من آه صبح گاہی داده اند
سطوت کوہی به کاہی داده اند

دارم اندر سینه نور لااله
در شراب من سرور لااله

فکر من گردون مسیر از فیض اوست
جوی ساحل ناپذیر از فیض اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثل تیغ بی نیام

....

پایان

(۱) میرزا صایب تبریزی در وصف شہر کابل می گوید: ع:-
خوشا وقتی که چشمم از سوادش سرمه چین گردد
(۲) تلمیح به حدیث مبارکہ لی خرقتان الفقر والجہادُ۔
(۳) سلطان محمد، فاتح قسطنطنیه
(۴) والاحضرت شاه ولی خان
(۵) مراد از زبور عجمؔ است که یکی از تصنیفات علامه اقبال است۔

☆☆☆

نتیجہ فکر گہر بار پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی

امام الشہدا

حق بات پہ اڑتے ہیں تو لڑتے ہیں قضا سے
رکھتے ہیں عقیدت جو امام الشہدا سے

کس طور سے ہوتا ہے کوئی فخر دو عالم
پوچھے کوئی مظلومیِ ارباب وفا سے

اب تک ہیں زمانے کے لیے زندگی آموز
حیدر کے جگربند محمد کے نواسے

شبیر کے صدقے میں لٹا دوں اسے فوراً
ہو دولت کونین بھی حاصل جو خدا سے

ہر دامن اولادِ نبی تک ہے رسائی
یہ فیض میسر ہے مجھے دست دعا سے

شبیریت اس دور میں بھی شان بشر ہے
پوچھے کوئی گاندھی سے پرستار وفا سے

اس دور یزیدی میں بھی جو سینہ سپر ہیں
اللہ بچائے انھیں آفت سے بلا سے

گلزارِ جناں سے نہیں کم مرتبہ ہرگز
وہ خاک جو گلرنگ ہے خونِ شہدا سے

اے دل مجھے اس ارض مقدس ہی پہ لے چل
نسبت ہے بلندی میں جسے عرشِ عُلا سے

اس دور میں بھی تازہ ہیں گلہائے عقیدت
محفوظ ہیں شاید یہ زمانے کی ہوا سے

☆☆☆

طاق نسیاں سے

مثنوی فغان صبح و مسا

(مبنی بر نسخۂ خدا بخش لائبریری)

سید ضامن حسین گویاؔ جہان آبادی

مقدمہ، تحقیق و حواشی

فیضان حیدر

مقدمہ

نام سید ضامن حسین، تخلص گویاؔ ہے۔ جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم جہان آباد میں ہی حاصل کی۔ صغرسنی سے ہی شعروشاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور اشعار موزوں کرلیا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعری استعداد نکھرتی گئی اور بہت جلد اپنے زمانے کے خوش فکر شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔ شعروادب سے دلچسپی کے باوجود درس نظامی پر بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔ فلسفہ ان کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے اور انھوں نے ساری زندگی اس کی گتھیوں کو سلجھانے اور اس کے مسائل کو حل کرنے میں صرف کردی۔

انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ وہ شعر گوئی کو اپنے دلی جذبات واحساسات پر قابو پانے کا بہترین وسیلہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں زندگی اور اس کے مسائل کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرنے، نئے نصب العین قائم کرنے اور زندگی کی ناقابل انکار الجھنوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عصر حاضر کے مسائل پر بھی خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور غور وخوض کے بعد ان کا حل تلاش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں سادگی، لطافت اور شیرینی قابل دید ہے۔ ابتدائی ادوار کے اشعار میں ناہمواری کھٹکتی ہے لیکن جیسے جیسے مشاہدات گہرے ہوتے گئے اور زندگی کا شعور حاوی ہوتا گیا اشعار کی اثر آفرینی اور لطافت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوکر مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ 'دورِنو' (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء) اور 'طلوع سحر' (نظامی پریس بدایوں، ۱۹۴۳ء) کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے اور مجموعوں کے حصے میں نہ آسکی۔ نثر و نظم میں مختلف موضوعات پر ان کی تقریباً درجن بھر کتابیں موجود ہیں۔

گویاؔ ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے شعر گوئی کے ساتھ نثری میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ دراصل ان کو فلسفے سے ذہنی مناسبت تھی اور اسلامیات میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ ان کی

غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا محبوب روایتی محبوب سے قدرے مختلف ہے۔ وہ پردہ نشین ہے اور وہ اسے بے حجاب دیکھنا پسند نہیں کرتے، جس نے ان کے اشعار میں عرفانیات کا گہرا اثر پیدا کر دیا ہے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات، قرآنی آیات اور اقوال پیغمبر (ص) کو بھی اس طرح شعری قالب بخشا ہے کہ وہ شعر کی زبان میں رچ بس جاتے ہیں اور اس کے دائرۂ کار کو وسیع تر کر دیتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

تلاش خضر نہیں راہ علم و عرفاں میں   نبیؐ ہیں شہر معارف، علیؑ ہیں باب علوم

......

رہروِ منزل خدا جانے کس افسانے میں ہے   اک قدم گلزار میں ہے ایک ویرانے میں ہے
قطرہ قطرہ جزوِ دریا، ذرّہ ذرّہ محوِ نور   دور ہے ساقی کا ورنہ کون میخانے میں ہے

......

زیست کا مفہوم یارب تا حد تصویر کیا   تو بدل سکتا نہیں مجبور کی تقدیر کیا
چشم و دل کے درمیاں ہے کس لیے شرط یقیں   سامنے ان کے خیال جلوہ و تنویر کیا
دیکھ ہر نقش نظر ہے روئے معنیٰ پر گراں   حسن خود تفسیر اپنی حسن کی تفسیر کیا

یہاں انھوں نے بخوبی 'ہمہ اوست' کے نظریے کا ابطال کیا ہے اور ان افراد پر لطیف طنز بھی کسا ہے جو عشق و معرفت میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ 'ہمہ اوست' یعنی دنیا و مافیہا ذات متجلی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ احساسات و جذبات نظر سے ماورا ہوتے ہیں فکر سے نہیں اور کائنات اثر تجلی ہے ذات متجلی نہیں یعنی دنیا و مافیہا معلول ہے اور ذات خدا علت۔ اس لیے معلول کو علت قرار دینا از روئے انصاف درست نہیں ہے۔

....

'فغان صبح و مسا' ان کی مشہور مثنوی ہے جس کو گویاؔ نے مولانا شفقت حسین معنوی کے نام معنون کیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں موجود ہے جو Acc. 4582 کے تحت درج ہے۔ اس پر نظامی پریس بدایوں کی مہر ثبت ہے۔ یہ مثنوی اسی مخطوطے سے نقل کی گئی ہے۔ اس پر جا بجا ان کے استاد حاجی خلیل الدین حسن المتخلص بہ حافظؔ کے قلم سے اصلاحات کی گئی ہیں۔ نقل نویسی میں اصلاح شدہ متن ہی اصل متن میں پیش کیا گیا ہے اور حواشی کے تحت اصل متن کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس کے سرورق پر ایک نوٹ درج ہے جس کا متن نقل کیا جاتا ہے:

''فی صفحہ گیارہ سطر لکھنا چاہیے۔ ٹائٹل پیج سادہ ہوگا، بیل بوٹے نہ ہوں گے۔ اس کے حاشیے پر جدول بھی نہ ہوگی۔ نظم کے صفحات پر اکہرے اور ہلکے خطوط جدول ہوں گے۔ سائز یہی ہوگا جو مسودہ کا ہے۔ کاغذ مطابق نمونہ کے وزن میں ہوگا۔ نمونہ مطبع

سے آیا ہوا موجود ہے مگر اس کا رنگ ذرا میلا ہے، وہ اور اُجلا ہونا چاہیے۔ ٹائٹل پیج کے کاغذ کا نمونہ جس کے مختلف رنگ ہوں گے، بجنسہٖ پسند ہے۔ (خلیل الدین حسن از پیلی بھیت، ۶ر جنوری ۱۹۲۰ء)''

اس عبارت اور مذکورہ مہر سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسودہ نظامی پریس میں طباعت کے لیے آمادہ کیا گیا تھا۔ لیکن یہ مثنوی شائع ہوئی یا نہیں اس کا علم نہ ہو سکا اور تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دریافت نہیں ہو سکا۔ 'فغان صبح و مسا' میں گویاؔ نے بارگاہ ایزدی میں دست دعا بلند کر کے اپنے اور مسلمانوں کے حالات کی بہتری کے لیے مناجات و دعا کی ہے۔

مناجات بندے اور معبود کے راز و نیاز کی باتیں ہیں جس میں بندہ معبود کی بارگاہ میں اپنی طلب اور درخواست پیش کرتا ہے یا مشکلات و مصائب کے حل کے لیے دعا کرتا ہے۔ مناجات کی بنیاد انسان کے ذاتی فقر اور ضرورتمندی میں پیوست ہے اور اس کا عبادت و بندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس طرح دعا تاریخ عالم میں ہر طرح کے انسانی معاشروں اور مختلف ادیان میں انفرادی اور اجتماعی شکل میں رائج رہی ہے۔ بعض شعرا نے تصوف و عرفان کے بلند پایہ مضامین اپنی مثنویوں میں نظم کیے ہیں۔ چنانچہ گویاؔ نے بھی اس مثنوی میں بارگاہ خداوندی میں مناجات کی ہے اور اپنے جذبات و احساسات کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

جب انسان پریشانیوں میں گھر جاتا ہے تو بارگاہ ذات باری تعالیٰ سے خود کو قریب محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے سامنے دست سوال دراز کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اسے بخوبی اندازہ ہے کہ یہی وہ ذات ہے جو سب کو مقصود تک پہنچاتی ہے۔ اگر وہ دے دے تو اس کی رحمت ہے اور اگر نہ دے تو حکمت۔ اس مثنوی میں گویاؔ نے اللہ کی حمد و ثنا، پیغمبر کی نعت خوانی اور حضرت علیؑ اور حسنینؑ اور اولیا اللہ کے صدقے میں اپنی حاجات اللہ کے حضور پیش کی ہیں، خصوصاً غوث جیلان اور خواجہ غریب نواز کے صدقے اپنی حاجات کی برآوری کی دعا کی ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی آشفتہ حالی اور زبوں حالی کا تذکرہ بھی بڑی دردمندی سے کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی حالت زار پر سر و سینہ پیٹتے ہیں اور ان کی بہتری کے لیے دعا گو ہیں۔ یہی حسرت، تڑپ اور بے چینی ان کی پوری مثنوی پر حاوی نظر آتی ہے۔

اس مناجات میں اگرچہ وہی مضامین بیان ہوئے ہیں جو اکثر قدیم شعرا نے پیش کیے ہیں۔ تاہم اس میں جو ایمانی حرارت موجود ہے وہ ہمارے قلوب کو کافی متاثر کرتی ہے۔ زبان بڑی حد تک سادہ اور سلیس ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی گویاؔ کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

☆☆☆

فغانِ صبح و مسا

تہدیہ

دلی شکر گزاری، خلوص اور منّت پذیری کے ساتھ یہ ناچیز نظم مولانا شفقت حسین معنوی، نظامی، سلیمانی، چشتی (۱) بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کے نام نامی واسمِ گرامی پر معنون کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہے۔
(ضامن حسین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اے مالک حکمت والے   اے مولا عظمت والے
اے خالق صنعت والے   اے قادر قدرت والے
اے اعلیٰ رفعت والے   اے بالا شوکت والے
یکتا ہے واجب ہے تو   داتا ہے واہب ہے تو
باطن تو ہے ظاہر تو   اوّل تو ہے، آخر تو
عالم تیرا مظہر ہے   آئینہ ہے منظر ہے
تو ہر گل میں رنگت ہے   ہر غنچے میں نکہت ہے
جُز میں جُز ہے، کل میں کل   کلی کلی میں گل میں گل
ہر گل میں ہے بو تیری   اور مہک ہر سو تیری
وحدت میں ہے کثرت میں   خلوت میں ہے جلوت میں
تو ہی ہے ہر حالت میں   تو ہی ہے ہر صورت میں
اے اِن آنکھوں کے تارے   اے میرے دل کے پیارے
دل میں رہ کر پردہ ہے   پردہ یہ اعجوبہ ہے
یہ ثابت یہ سیّارے   روشن روشن یہ تارے

بحرِ اعظم پُر شوکت   برّ اعظم پُر وسعت
موجیں بادِ صرصر کی   لپٹیں نار و اخگر کی
گرمی، خشکی، یہ سردی   پانی، مٹی، یہ بجلی
کانوں کے یہ سب جوہر   دریاؤں کے سب گوہر
گلشن کے سب گل بوٹے   ہرے بھرے یہ سب پودے
طرح طرح کے سب حیوان   جن میں اشرف ہے انسان
جلوے ہیں سب قدرت کے   تیری حکمت و صنعت کے
لاثانی ہے، یکتا ہے   بے شک تو بے ہمتا ہے
میرا منھ تیری مدحت   عاجز کو ہے کب قدرت
میں تو ادنیٰ ذرّہ ہوں   ذرّے سے بھی ادنیٰ ہوں (۲)
ناواقف ہوں منزل سے   دور پڑا ہوں ساحل سے
بحرِ گنہ میں ڈوبا ہوں   آس سے تجھ کو تکتا ہوں
حالت میری ابتر ہے   دامن عصیاں سے تر ہے
آنکھ سے آنسو جاری ہے   ہردم گریہ و زاری ہے
تو ہے دانا جیسا ہوں   جیسا ہوں میں تیرا ہوں
یا اللہ ستّار ہے تو   یا اللہ غفّار ہے تو
تو ہی حیّ و قائم ہے   تو ہی باقی، دائم ہے
نغمہ تیری وحدت کا   چڑیاں گاتی ہیں گویا
شور مچا ہے گلشن میں   غل ہے برپا بن بن میں
بن کے پکھیرو صبح و مسا   پڑھتے ہیں تیرا کلِما
ہر ہر نغمے سے گویا   آتی ہے بس اک یہ صدا
لا موجود الاّ ہُوَ   لا مشہود الا ہو
لا معبود الا ہو   لا مسجود الا ہو
ذکر و وردِ ہر بُن و مو   لا الٰہ الا ہو
تیری ہی سب کایا ہے   تیری ہی سب مایا ہے

یا اللہ یا من موہن — ہے تیرا سب تن من دھن
دریا کرنا قطرے کو — پربت کرنا ذرّے کو
قطرے کو گوہر کرنا — پتھر کو جوہر کرنا
زندہ کرنا مردے کو — بینا کرنا اندھے کو
آب کا دینا قطرے کو — تاب کا دینا ذرّے کو
بل ہیں تیری قدرت کے — پھل ہیں نخلِ رحمت کے
بےکس پر رحمت کرنا — بےبس پر شفقت کرنا
آساں کرنا مشکل کو — تسکیں دے دینا دل کو
عادت تیری جاری ہے — سب میں جاری، ساری ہے
مولا میں اک قطرہ ہوں — ادنیٰ سا اک ذرّہ ہوں
بیکل ہوں بے دل ہوں میں — بسمل سا بسمل ہوں میں
یاس ہوں میں گو سر تا پا — آس بھی ہے تجھ سے مولا
مردہ ہوں زندہ کردے — اندھا ہوں بینا کردے
دریا کردے قطرے کو — مہر بنادے ذرے کو(۳)
تسکیں دے دے اس دل کو — ساکن کردے بسمل کو
رحم ذرا کر بسمل پر — فضل و عطا کر اس دل پر
تسکیں دل کو آس سے دے — ڈھارس اپنے پاس سے دے
اپنا جلوہ دکھلا دے — اس ذرّے کو چمکا دے
پردے سے باہر آجا — اپنا مکھڑا دکھلا جا
پھونک دے مجھ کو سر تا پا — دکھلا کر اپنا جلوہ
پیارا جلوہ دکھلا دے — ایک جھلک سے تڑپا دے(۴)
لے کے جلادے یہ گھر در — پھونک دے سب اندر باہر
من میں ایسی آگ لگے — جس سے یہ ہر دم سلگے
دل میرا آئینہ ہو — آئینے میں جلوہ ہو
ہو جلوہ آئینے میں — آئینہ آئینے میں

آخر محرومی کب تک — قسمت کی شومی کب تک
کب تک میرا دل ترسے — دیدۂ تر کب تک برسے
صدقہ اپنے جلوے کا — صدقہ اپنے پردے کا
بیچ کا پردہ اٹھا بھی دے — وہم دوئی کا مٹا بھی دے
تو ہی کنزِ مخفی تھا — جیسا ہے فرمان ترا
اپنا جلوہ دکھلانا — جب تونے خود ہی ٹھانا
پردے پردے میں آیا — اپنا جلوہ دکھلایا
جلوہ اپنا دکھلا کر — ظاہر نظروں میں آکر
نظروں سے مخفی ہونا — مخفی بھی خود ہی ہونا
کیا ہی تیری قدرت ہے — جس سے دل کو حیرت ہے
پردہ ہے اک غفلت کا — میری نظروں پر ایسا
جس سے سب یہ دوری ہے — جس سے یہ مجبوری ہے
کردے تو بیدار مجھے — غفلت سے ہُشیار مجھے
یہ ہے میری تجھ سے دعا — اے داتا میرے مولا
پیارے کے اپنے صدقے میں — اپنے نبی کے صدقے میں
جو ہے کعبے کا کعبہ — جو ہے قبلے کا قبلہ
وہ جو آقا ہے سب کا — وہ جو مولا ہے میرا
وہ جو میرا والی ہے — وہ جو سب سے عالی ہے
وہ جو میرا سرور ہے — وہ جو تیرا مظہر ہے
وہ جو ہادی ہے سب کا — وہ جو مہدی ہے تیرا
وہ جو اول آخر ہے — وہ جو باطن ظاہر ہے
جو نبیوں سے اعلیٰ ہے — جو ولیوں کا مولا ہے
مسلم کا ایمانِ جاں — مومن کا جانِ ایماں
وجہِ خلقِ امکانی — روحِ سرِّ انسانی
سرّ جانِ قرآنی — رمزِ روحِ فرقانی

شمعِ نورِ یزدانی   ظلِّ ذاتِ رحمانی
ہے جو قلزم عرفاں کا   بحرِ اعظم احساں کا
دونوں عالم میں گویا   بجتا ہے جس کا ڈنکا
ہر جا ہے جس کا جلوہ   جس کا ہے جلوہ، جلوہ
ہر ڈالی، ہر پتّے میں   ہر بالی، ہر غنچے میں
ہر پتے، ہر پودے میں   ہر گل میں، ہر بوٹے میں
ہر ذرّے، ہر قطرے میں   جلوہ جس کا پردے میں
یعنی وہ احمدؐ مرسل   ہے جو انسانِ اکمل
صدقے میں اس کے داتا   سن لے تو میری مولا
تیرے مرسل پیارے کی   ہے جو امت کہلاتی
حالت اس کی ابتر ہے   ابتر سے بھی بدتر ہے
عزّت، شوکت کے بدلے   دولت، ثروت کے بدلے
علم و عرفاں کے بدلے   دین و ایماں کے بدلے
ذلت، نکبت، خواری ہے   ناداری، بےیاری ہے
نادانی، حیرانی ہے   اس پر بےسامانی ہے
ہے یہ بکھرا شیرازہ   یا اللہ اس امت کا
یکسر آپا دھاپی ہے   لب پر نفسی، نفسی ہے
نا شائستہ ہے حالت   حیوانوں کی خو خصلت
دولت ثروت کھو بیٹھے   کب سے اس کو رو بیٹھے
حاکم سے محکوم ہوئے   منصف تھے مظلوم ہوئے
خادم جو تھے(۵) حاکم ہیں   حاکم جو تھے خادم ہیں
کعبے پر بھی ہے حملہ   یا اللہ اب دشمن کا
غوغا سا اک غوغا ہے   نرغا سا اک نرغا ہے
مسلم غم کے مارے پر   بےکس پر بےچارے پر
تو ہے دانا اے مولا   تو ہے بینا اے داتا

ہے چکّر میں اب کشتی   یا اللہ اس امت کی
جُز تیرے کون ترائے   کس میں بل جو پار لگائے
دیر ہے کیا اب اے مولا   وقت ہے تیری رحمت کا
بخش خطائیں رحمت سے   اپنی عینِ عنایت سے(۶)
ہم کو تو پھر عزت دے   شوکت، طاقت، رفعت دے
مولا! دولت، ثروت سے   کاسۂ مسلم پر کردے
علم و عرفاں، ایماں سے   سینۂ مسلم کا بھر دے
سنبھلے اخلاقی حالت   اچھی کردے خو خصلت
دےدے آپس کی الفت   انسانوں کی خو خصلت
بے یاروں کا یاور ہو   حامی تو اے داور ہو
دشمن پر تو غلبہ دے   مولا! اپنی قدرت سے
اللہ! اپنی رحمت سے   ہم کو فتح و نصرت دے
دین نبی کو رحمت دے   چمکا دے سب دینوں سے(۷)
کفر کے ہیں جتنے شعبے   نام و نشاں ان کا کھودے
مسلم کے خواہانِ جاں   یارب جو ہیں بے ایماں
ان کو تو نیچا دکھلا   پھل دےدے بے دردی کا
ایسی ایک نظر ہم پر   اے رب! اے ذرّہ پرور!
چھوٹیں غم کے پنجے سے   کام بنیں جو ہیں بگڑے
دشواری، سختی، تنگی   پیش نہ آئے ہم کو کبھی
ہر مشکل کو آساں کر   اپنا فضل و احساں کر
علیؑ ولی کے صدقے میں   نفسِ نبی کے صدقے میں
جو ہیں اک بحرِ عرفاں   جو ہیں اک ناطق قرآں
جو ہیں فقرا کے سالار   جو ہیں عرفا کے سردار
جو ہیں فقہا کے آقا   جو ہیں علما کے مولا
مالک دین و دنیا کے   مولا ہیں جو عقبیٰ کے

مولا قول فیصل سے
حضرت کی کل امت کے

مخزن جو اسرار کے ہیں
مشرق جو انوار کے ہیں

سرور جو احرار کے ہیں
قاتل جو اشرار کے ہیں

آقا جو ابرار کے ہیں
سید جو اخیار کے ہیں

فاتح جو خیبر کے ہیں
قاتل جو عنتر کے ہیں

وہ جو شاہ مرداں ہیں
وہ جو شیر یزداں ہیں

ہیں جو ان کے نورِعین
یعنی حضرات حسنین

بستانِ حضرت کے گل
جانِ محبت، جان کل

خیر مجسم سر تا پا
حسنِ صورت میں یکتا

آں حضرت کے ہم صورت
گویا تصویرِ حضرت

سیرت، تفسیرِ قرآں
صورت، تصویرِ رحماں

راکبِ دوشِ آں حضرت
اللہ اللہ یہ رفعت

امت پر قربان ہوئے
لختِ دل آں حضرت کے

ہیں وہ سردارِ شہدا
ایسا ہے کس کا رتبہ

ان کا صدقہ اے مولا
صدقہ آلِ حضرت کا

بہر اصحاب حضرت
بہر احباب حضرت

ہیں جو سنت کے حامی
دین و ملت کے حامی

صدقہ غوثِ اعظم کا
صدقہ قطب عالم کا

صدقہ شاہِ جیلاں کا
صدقہ مہرِ عرفاں کا

صدقہ اپنے پیارے کا
اپنے پیارے دلارے کا

سن لے میری اے مولا
مجھ کو بھی طیبہ دکھلا

جب کوئی طیبہ جاتا ہے
میرا دل بھر آتا ہے

منھ اس کا میں تکتا ہوں
تکتے تکتے تھکتا ہوں

بخش خطا میری مولا
صدقہ اپنی رحمت کا

چمکا دے مولا تارا
اس ذرّے کی قسمت کا

طیبہ دکھلا دے مولا
طیبہ پہنچا دے مولا

اپنے پیارے کا روضہ
مجھ کو دکھلا دے مولا

شاہ بطحا کا صدقہ
مولا دکھلا دے طیبہ

اپنے نبی کی الفت سے
سینے کو میرے بھر دے(۸)

صدقہ ہند کے دولہا کا
یعنی پیارے خواجہ کا

یعنی وہ سلطان ہند
سرکارِ ذیشانِ ہند

خورشیدِ عرفانِ ہند
حامیِ سکّانِ ہند

سالارِ کملائے ہند
سرتاجِ عرفائے ہند

مولائے غربائے ہند
آقائے امرائے ہند

دارو ہم دکھیاروں کے
چارہ گر بیچاروں کے

ہیں جو تیری رحمت سے
پیارے خواجہ ہم سب کے

صدقے میں ان کے داتا
کر دے بھلا تو منگتا کا

صدقہ اپنے یاروں کا
کل یاروں کے پیاروں کا

جس دم نزع کا ہو عالم
جس دم نکلے میرا دم

پیارے نبی کا ہو جلوہ
نظروں میں میری مولا

میرے دل کو قوت دے
تو قوّت ایمانی سے

چشمِ کرم مجھ پر مولا
تا ہوں طالب بس تیرا(۹)

روگرداں ہوں دنیا سے
بے پروا (۱۰) ہوں عقبیٰ سے

دل کو نورِ عرفاں دے
اٹھ جائیں جس سے پردے

بےخود ہوں میں سر تا پا
ہو مجھ کو وہ جام عطا

کردے تو گمنام مجھے
دے کے فنا کا جام مجھے

دے اپنا دیدار مجھے
کردے تو بیدار مجھے

دے اپنا آزار مجھے
رکھ اپنا بیمار مجھے

کر اپنا میخوار مجھے
مے دے کر سرشار مجھے

دل کو میرے یک رو کر
دھیان کو میرے یکسو کر

پھیر دے دل کو سب سے تو   کردے اس کو بس اک سو

سوز کا اپنا ذرّہ دے   ساز کا اپنے چسکا دے

ملک بقا میں راحت دے   کرکے فنا فی الذّات مجھے

کھول بھی دے میخانے کو   بھر دے اس پیمانے کو

دھو دے دل سے زنگِ دوئی   کھودے دل سے رنگ دوئی

وہ دے مجھ کو دانائی   ہوں تیرا ہی سودائی

یہ ہے میری اور دعا   یعنی اتنی اور دعا

ہر حاجت کو تو برلا   ہر مومن کی اے مولا

ہر خواہش جو دل کی ہو   مومن کی وہ پوری ہو

رکھ مسلم کو خوش خرّم   بےاندیشہ اور بےغم

بیماروں کو صحت دے   کمزوروں کو طاقت دے

بےوطنوں کو گھر پہنچا   اُن کا گھر اُن کو دکھلا

قبضے میں ہے سب تیرے   پل میں تو جو چاہے کرے

روک زباں اب اے گویاؔ   جی ہی جی میں(۱۱) مانگ دعا

☆☆☆

تواریخ ریختۂ کلک گہرسلک استاذی وملاذی قاضی حاجی حافظ خلیل الدین حسن صاحب المتخلص بہ حافظؔ

قال کہوں یا حال کہوں   حال ہے یا ذکرِ وحدت

فکر سال میں دل حافظؔ   بول اٹھا ذکرِ وحدت

۱۳۳۸ھ

دیگر

اس کا مصنف ہے گویا   خوش رو، خوش خو، خوش مذہب

مخبرِ سال ہے یہ مصرع   معتکف صوفی مشرب

۱۳۳۸ھ

دیگر

میکدے میں ہے نوشانوش   ہوش و خرد کا کس کو ہوش

حافظؔ کہہ دو یوں تاریخ   شورش بندۂ حلقہ بگوش

۱۳۳۸ھ

دیگر

فکر سال میں تم لاریب   حافظؔ بیٹھے ہو سر در جیب

کوئی اگر نہ لگاوے عیب   کہدو ادائے شاہد غیب

۱۳۳۸ھ

☆☆☆

حواشی:

(۱) یہ عبارت ان کے استاذ قاضی حافظ حاجی خلیل الدین حسن صاحب المتخلص بہ حافظؔ کے قلم سے اضافہ کی گئی ہے: نظامی، سلیمانی، چشتی

(۲) دراصل: یا ذرّے سے چھوٹا ہوں

(۳) دراصل: چمکا دے اس ذرّے کو

(۴) دراصل: اپنا جلوہ دکھلا دے-ایک نظر سے تڑپا دے

(۵) دراصل: اپنے

(۶) دراصل: اپنی رحمت شفقت سے

(۷) دراصل: مولا اپنی رحمت سے

(۸) یہاں سے دس اشعار اضافہ کیے گئے ہیں جو بعد اصلاح لکھے گئے ہیں۔

(۹) دراصل: طالب ہوں میں بس تیرا

(۱۰) دراصل: لا پروا

(۱۱) دراصل: چپکے چپکے

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: علیم اللہ حالی کی نظمیں مصنف: ڈاکٹر محسن رضا رضوی
صفحات: 156 قیمت: 150 روپے
سالِ اشاعت: 2014ء ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6
تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

موجودہ دور میں کئی ہیئتوں میں نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ پابند نظموں کے ساتھ نظم معریٰ اور نثری نظموں کا رواج بھی عام ہے۔ ترقی پسند تحریک نے غزل کی تنگ دامانی کی شکایت کے ساتھ ہر طرح کی نظموں کا خیر مقدم کیا۔ جدیدیت کے دور میں بھی نظم معریٰ اور نثری نظموں کا عام چلن رہا۔ اب اکیسویں صدی میں پابند نظمیں بہت کم لکھی جارہی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آزاد اور نثری نظموں میں خیالات بہتر اور منضبط طریقے سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

عصر حاضر میں آزاد اور نثری نظموں کے میدان میں جن افراد نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے ان میں علیم اللہ حالی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دو تین دہائیوں میں انھوں نے نظم نگاری کے میدان میں اپنے فن کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ اعلیٰ درجے کی شاعری کا حصّہ ہونے کے ساتھ عصری حسیت کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ان نظموں میں سادگی، برجستگی، نیاپن اور ذمہ داری کا احساس بہ درجہ اتم موجود ہے۔ ان کی تقریباً تمام نظموں میں دل چھو لینے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب علیم اللہ حالی کی منتخب نظموں کے تنقیدے جائزے پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے اس کتاب میں ان کی چالیس منتخب نظموں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے ان نظموں کو کتاب میں یکجا بھی کردیا ہے تاکہ قارئین کو مطالعہ میں آسانی ہو اور وہ اپنی سطح پر بھی آزادانہ طور پر ان کے محاسن سے لطف اندوز ہوں۔

غزلوں یا نظموں کا انتخاب بھی ایک مشکل فن ہے۔ اس میں انسان کی ذاتی پسند و ناپسند کا عمل دخل رہتا ہے۔ ہر شخص کی اپنی ذاتی پسند و ناپسند کی مختلف وجہیں ہوتی ہیں جن کے تئیں وہ کسی فن پارے سے متعلق رائے زنی کرتا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے علیم اللہ حالی کی دس تازہ ترین نظموں کا تجزیہ ہے، پھر ان کے مجموعے 'لفظ، آواز، صورت گری'، 'نخل جنوں' اور 'سفر جلتے دنوں کا' سے دس دس نظموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

حالی کی نظموں کے مطالعے کے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں اپنے زمانے کے دوسرے شاعروں کی نظموں سے خاصی مختلف ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی مقبول ترین صنف سخن 'غزل' کے بجائے نظم گوئی کو ترجیح دی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ نظم میں اپنے خیالات کو تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی زیادہ گنجائش موجود ہے اور اس میں موضوعات کی تمام جزئیات کو نمایاں کرنے کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں:

> ''مجھے یہ اندازہ ہے کہ غزل کے مقابلے میں، میں نظموں کے ذریعہ اپنے آپ کو نسبتاً زیادہ ایمانداری کے ساتھ پیش کرسکتا ہوں۔ غزل بالعموم میری گرفت سے نکل بھاگتی ہے۔'' (علیم اللہ حالی کی نظمیں، ص6)

اس ناکامی کی اصل وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ فکر و تخیل کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جو اشیا پر خارج سے اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ طرز تفکر و تخیل حقیقت اور تصور کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل کردیتا ہے۔ تاہم ان کے یہاں تخیل محض ایک اصول کے طرز پر نہیں ہے جو خارج سے مادہ کو مرتب اور منضبط کرتا ہے بلکہ ایک ایسی استعداد ہے جو خود ہی صورت گری بھی کرتی ہے۔

ان کی نظموں کا غایتی اور وجودیاتی پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب ہم مطالعے کے ذریعہ ان کی تہوں تک پہنچتے ہیں۔ درحقیقت وہ خارجی اور باطنی دونوں قسم کے تجربات کو حقیقت کی نشانی تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے حسی تجربات کے اظہار کے لیے الفاظ و عبارات کا سہارا لیا ہے اور انکشافات کے گل کھلائے ہیں۔ اس طرح ان کی نظمیں فطرت کی ترجمان ہیں۔ ان میں ایک طرف ذہنی ارتسامات ہیں تو دوسری طرف ناقابل تصدیق اور ناقابل ادراک اشیا۔ اس طرح یہ نظمیں کبھی فطرت اور شاہد فطرت کے مابین خلیج کو پاٹتی نظر آتی ہیں تو کبھی اسی خلیج میں سرگرداں۔ درحقیقت ان کی نظموں میں اردو کی کلاسیکی روایات کا رچاؤ بھی ہے اور نئے لہجے کا بانکپن بھی جو قارئین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔

ان کے یہاں ایسی نظموں کی تعداد بھی خاصی ہے جو اپنے منفرد اور اثر انگیز پیرایۂ بیان کی وجہ سے زیادہ موثر ہوگئی ہیں۔ زیر نظر کتاب اردو کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے ایک قابل قدر کاوش ہے۔ بلا مبالغہ یہ اردو کے تنقیدی سرمایے میں ایک مفید اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے جو زبان استعمال کی ہے وہ تنقید کے عین مناسب ہے۔ سلیس انداز اور سادہ لب و لہجے کی وجہ سے دوران مطالعہ قارئین کو ذہنی انقباض یا اکتاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ڈاکٹر محسن رضا کی یہ ادبی کاوش یقیناً قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔

نظموں کے مطالعے کے وقت انھوں نے حالی کی ذہنی ساخت اور موجودہ صورتحال کو پیش نظر رکھا

ہے۔انھوں نے شعوری طور پر حالی کے ذہن وفکر، سیرت وشخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے نظموں کا جائزہ لیا ہے جس سے بڑی حد تک شاعر کی سچی تصویر ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

اسی طرح آخر میں ضمیمہ کے عنوان سے علیم اللہ حالی کے تینوں مجموعوں کے پیش نامے 'ماقبل' (لفظ، آواز، صورت گری)، 'اپنی باتیں' (نخل جنوں) اور 'پیش گفتار' (سفر جلتے دنوں کا) شامل کردئے ہیں۔ان میں علیم اللہ حالی نے نظم گوئی سے متعلق اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کیا ہے جو ان کی نظموں کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہیں۔

اس کتاب کے شروع میں 'علیم اللہ حالی کی نظمیں' کے عنوان سے ان کی نظم گوئی کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی فکری اور فنی خصوصیات کے ساتھ ان کی شاعرانہ قدرومنزلت کا بھی بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب پر پروفیسر وہاب اشرفی کا مختصر تبصرہ بہت ہی جامع اور پُر مغز ہے۔اس سے حالی کی شخصیت اور شاعری کے حقیقی خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔اس کے بعد مصنف نے علیم اللہ حالی کی نظم گوئی پر شرح وبسط سے تبصرہ کیا ہے اور ان کی منتخب نظموں کا جائزہ لیا ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا کہ یہ کام حالی کی شاعری کے حوالے سے حرف آخر ہے لیکن اتنا کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ یہ آغاز ہے جو آئندہ حالی کی نظموں کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں معاون ہوگا۔

☆☆☆

نام کتاب: اجرِ رسالت — شاعر: اصغر مہدی ہوشؔ
مرتب: شکیل حیدر شکیلؔ — مدون: وسیم حیدر ہاشمی
صفحات: 267 — قیمت: 450روپے
سال اشاعت: 2018ء — ناشر: لومینس بکس، وارانسی 221001
تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

اصغر مہدی ہوشؔ جونپوری ان شعرا میں سے ہیں جنھیں تمام اصناف سخن پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اردو کی غزلیہ شاعری میں اچھے نمونے پیش کرکے نہ صرف اردو کے دامن کو وسعت بخشی بلکہ شیراز ہند جونپور کی بہترین نمائندگی بھی کی۔انھوں نے صغر سنی سے ہی شاعری شروع کردی تھی۔تقریباً دس بارہ برس کی عمر میں اپنی پھوپھی کے انتقال پر ایک تعزیتی نظم کہی جو ان کی پھوپھی کے متعلق ان کے جذبات و احساسات کی بہترین آئینہ دار ہے۔اس میں درد، سوز وگداز ہونے کے باوجود زبان وبیان کی خوبیاں بھی

پائی جاتی ہیں۔اس کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

بلبلِ کنجِ قفس مائل پرواز ہوئی
ہاتھ سے جام گرا، جھن سے اک آواز ہوئی

ان کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ 1984ء میں ہی شائع ہوکر داد وتحسین وصول کر چکا ہے۔غزلوں اور نظموں کے علاوہ مرثیہ، سلام، نعت، منقبت اور قصیدے بھی وافر مقدار میں کہے ہیں اور مذکورہ اصناف پر اپنی دسترس کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔تاہم رثائی ادب سے ان کو خاص دلچسپی تھی جو آخر دم تک برقرار رہی۔انھوں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مرثیہ کے فنی رموز ونکات سے واقفیت بہم پہنچائی تھی جس کی وجہ سے ان کے مرثیوں میں ایک خاص رنگ کی جھلک نظر آتی ہے جو انھیں ان کے ہم عصر مرثیہ گویوں سے ممتاز کرتی ہے۔

وہ کربلا کے دل دوز سانحے سے حد درجہ متاثر تھے اور اسے رزمگاہ حق وباطل سے تعبیر کرتے تھے۔ واقعات کربلا کی حدود میں رہ کر بھی نئے نئے مضامین اختراع کرتے اور ان میں رنگ بھرنے کے لیے اکثر عقیدت کا سہارا لیتے تھے، جس سے واقعات کربلا کی حدود میں رہ کر بھی ان کے یہاں تنوع ملتا ہے جو ان کے قادر الکلام ہونے ساتھ زبان وبیان پر دسترس کا بھی جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ایک مرثیہ کا پہلا بند دیکھیے:

جب کربلا میں نازش آدمؑ ہوا شہید — نور نگاہ اشجع عالم ہوا شہید
محضر مآب مرسل اعظم ہوا شہید — پروردگار دین مکرّم ہوا شہید
دستار عصر کھل کے زمیں پر بکھر گئی
سر سے ردائے غیرت آدم اتر گئی

وہ معرکۂ کربلا کو حق وباطل کے درمیان خط تنسیخ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہیں سے حق وباطل کے درمیان حد فاصل قائم ہوگئی اور باطل کے چہرے سے نقاب اتر گئی۔کربلا اور واقعات کربلا کے پس منظر میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جملہ تجلیات کا مرکز ہے کربلا ..... پہلی سحر یہیں ہوئی شام حیات کی
زندگی اب مسکرانے کی تمنا ہے فضول — تیرے ہونٹوں کا تبسم تو گیا اصغر کے ساتھ
پی گئی تشنہ لبی کل بحر ظلمات یزید — مٹ گئے دنیا سے ظالم اپنے بام ودر کے ساتھ

'اجر رسالت' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے ان کے غزلیہ کلام سے ہٹ کر نعت، قصیدہ، نظم، مرثیہ، سلام اور نوحے کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب وتدوین کا کام شکیل حیدر شکیلؔ اور وسیم حیدر ہاشمی نے انجام دیا

ہے۔اس میں چار نعت، تیس سلام، چالیس نوحے، ایک مرثیہ، پانچ نظم، انسٹھ قصیدے کے ساتھ شکیل حیدر شکیل کی تعارفی تحریر 'احوالِ واقعی' اور وسیم حیدر ہاشمی کا مختصر تاثر 'ہوش صاحب کے تعلق سے' شامل ہیں۔ شکیل حیدر شکیل کی تحریر ہوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں مفید و معاون ہے۔ اسی طرح وسیم حیدر ہاشمی کی تاثراتی تحریر بھی کئی جہتوں سے اہم ہے۔

زیر نظر مجموعہ ہوشؔ جونپوری اپنی زندگی میں ہی ترتیب دے رہے تھے اور اس کے مسودے پر ایک مختصر 'تاثرات' لکھ کر کاتب کے حوالے کر دیا تھا لیکن اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے وہ دارفانی سے کوچ کر گئے۔ بعد کو یہ مسودہ کاتب کے یہاں سے ان کے بھتیجے شکیل حیدر شکیل کو ملا۔ انھوں نے وسیم حیدر ہاشمی سے اس کی ترتیب وتدوین کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ دونوں کی اجتماعی کوششوں سے اس کی ترتیب وتدوین کا کام انجام پایا۔ اس سلسلے میں دونوں حضرات دادوتحسین کے مستحق ہیں۔ ان کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ البتہ دونوں حضرات کی ہوشؔ جونپوری کے متعلق تحریں بہت مختصر ہیں جو ان کی شخصیت اور شاعری کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کرتیں اور تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں پروف کی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں جن کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔ کتاب مرتب و مدون اور ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو سے فراہم کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

نام کتاب: تاریخ نگاری منہاج سراج مصنف: فیضان جعفر علی
صفحات: 176 قیمت: 100000 ریال (ایرانی)
سال اشاعت: 1396ش ر 2017ء ناشر: انتشارات سفیر اردہال، تہران
تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

تاریخ کے ذریعہ ہم ماضی میں پیش آنے والے واقعات اور انفرادی واجتماعی افعال وکردار سے واقفیت بہم پہنچاتے ہیں۔ تاریخ ہی ایسا علم ہے جس کے ذریعہ انسانی زندگی اور اس کے تہذیب وتمدن کا کارواں روز بروز ارتقائی منازل سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ تاریخ کے ذریعہ انسان اپنے ماضی کی فروگزاشتوں سے باخبر ہوتا ہے اور آئندہ کے لیے لائحۂ عمل تیار کرتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں مستقبل میں مشکلات اور پریشانیوں سے خود کو محفوظ رکھے۔

زیر تبصرہ کتاب 'تاریخ نگاری منہاج سراج' ڈاکٹر فیضان جعفر علی کی کئی سال کی مسلسل جد و

جہد اور تحقیق و تنقیح کے بعد انتشارات سفیر اردہال، تہران سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نوجوان محققین کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں علم تاریخ خصوصاً تاریخ ہندوستان میں خاصی مہارت حاصل ہے۔ اس سے پہلے ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'تاریخ پورہ معروف اور شیعہ علما و اکابر' نے کافی شہرت حاصل کی۔ تاریخ کے حوالے سے ان کی کئی کتابیں زیر ترتیب بھی ہیں جو تاریخ میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا بین ثبوت ہیں۔

زیر نظر کتاب ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کی ترتیب یہ ہے: مقدمہ، زندگی نامہ وآثار منہاج سراج، دیدگاہ تاریخی مولف، انگیزہ و ہدف، منابع کتاب، روش تاریخ نگاری مولف، شیوۂ تاریخ نگاری، معرفی ونقد محتویات، سبک نگارش اور منابع و مآخذ۔ مقدمے میں انھوں نے منہاج سراج کی حیات اور علمی کارناموں کا تذکرہ مختلف منابع سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ثانوی منابع سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کی ہے اور مطالب کو مدلل بنانے میں مختلف زبانوں کی کتابوں از جملہ ہندی اور انگریزی سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کی چوتھی اور چھٹی فصل بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ چوتھی فصل میں فاضل مصنف نے منہاج سراج کی تاریخ نویسی کا تحلیلی جائزہ لیا ہے اور تاریخ نگاری میں ان کی مہارت کے ساتھ ان کی لغزشوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ تاریخ نویسی میں دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک واقعات کا انتخاب اور دوسرے ان کی صحت اور عدم صحت کی جانچ اور پرکھ۔ منہاج سراج کو ان دونوں چیزوں میں مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ اپنے عہد کی اہم تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔

اس کتاب کی آٹھویں فصل اس لیے اہم ہے کہ اس میں فاضل مصنف نے منہاج سراج کی کتاب 'طبقات ناصری' کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے معروضی انداز سے اس کتاب کے مواد کی جانچ پرکھ کی ہے اور مآخذ کے تعین کے ساتھ ان کی لغزشوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ہر باب میں انھوں نے اہم انگریزی اور اردو مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیضان جعفر علی ہندوستان کی عہد بہ عہد تاریخ سے بخوبی واقف ہیں ساتھ ہی تاریخ نویسی کے جو پیمانے مقرر کیے گئے ہیں ان کا بھی پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تاریخ کے طالب علموں کی ضروریات کو حتی المقدور پورا کرے گی کیونکہ مصنف نے اس کے مطالب کو قابل فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان میں ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی پورہ معروف، مئو اور خود مصنف سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

نام کتاب: تاریخ معظم آباد معروف بہ گورکھپور
مصنف: مفتی مولوی سید غلام حضرت
مقدمہ، تصحیح وتحشیہ: فیضان حیدر
صفحات: 96 — قیمت: 250 روپے
سال اشاعت: 2016ء — ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6
تبصرہ نگار: فیضان جعفر علی

تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری ہمیشہ سے ایک دلچسپ موضوع رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے تاریخ نویسی (بالخصوص فارسی تاریخ نویسی) میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اگر وسیع معنوں میں تاریخ کا جائزہ لیں تو تاریخ کا اطلاق ان تمام حالات اور واقعات پر ہوتا ہے جو ماضی میں کبھی رونما ہو چکے ہیں، مگر ہم ماضی کی کسی شے کا نہ تو مشاہدہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی تجربہ کیونکہ مشاہدے اور تجربے کا تعلق براہ راست زمانۂ حال سے ہے۔ ماضی کا بالواسطہ مطالعہ ان آثار و باقیات کی مدد سے کیا جاتا ہے جنھیں نسل انسانی نے مختلف حالات اور زمانے میں بطور ورثہ چھوڑا ہے اور جن تک ہماری رسائی اب تک ممکن ہو سکی ہے۔ محققین نے تاریخ کی درجہ بندی کے تین طریقے بتائے ہیں۔

۱۔ نوعیت کے اعتبار سے تاریخ کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں: مقامی تاریخ، صوبائی یا علاقائی تاریخ، ملکی تاریخ، طبقاتی تاریخ اور عالمی تاریخ وغیرہ۔

۲۔ موضوع کے اعتبار سے تاریخ، سیاسی، تمدنی، ثقافتی، اقتصادی اور اجتماعی وغیرہ ہوتی ہے۔

۳۔ ہیئت کے اعتبار سے مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں: مختصر تاریخ، جامع تاریخ، عمودی تاریخ، افقی تاریخ وغیرہ۔

تاریخی نقطۂ نظر سے جو علاقے خاص اہمیت کے حامل رہے ہیں، ان سے متعلق بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں، انھیں میں سے 'تاریخ معظم آباد معروف بہ تاریخ گورکھپور' بھی ہے۔ چونکہ قدیم الایام سے گورکھپور سیاسی، ثقافتی، جغرافیائی لحاظ سے ایک اہم علاقہ رہا ہے۔ اس لیے مولف نے یہاں کے ہمہ جہت آثار کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے صفحۂ قرطاس پر اتار دیا۔ یہ کتاب نوعیت کے اعتبار سے علاقائی تاریخ محسوب ہوگی اور موضوع کے اعتبار سے اسے کسی خاص موضوع سے منسوب کرنا تھوڑا مشکل ہے کیونکہ اس میں مولف نے مختصر ہی سہی مگر تقریباً ہر موضوع یعنی گورکھپور کی سیاست، تمدن، ثقافت، جغرافیا، اجتماع واقتصاد وغیرہ کو بیان

کرنے کی کوشش کی ہے اور ہیئت کے اعتبار سے اس کا شمار 'مختصر تاریخ' میں کیا جائے گا۔

زیر نظر کتاب مفتی مولوی غلام حضرت نے تالیف کیا ہے جسے ۱۸۷۲ء میں منشی نول کشور پریس لکھنو نے شائع کیا۔ یہ دراصل فارسی میں تحریر کی گئی ہے اور جہاں موضوع کے لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے وہیں گورکھپور کی تاریخ سے متعلق قدیم ماخذ بھی۔ برادرم فیضان حیدر نے ۲۰۱۶ء میں اس کی تجدید اشاعت کے بعد چار چاند لگا دیے ہیں۔

انھوں نے اس کتاب میں ایک مقدمہ کا اضافہ کیا ہے ساتھ ہی اس دور کے فارسی کے ثقیل الفاظ اور اصطلاحات کی حاشیے میں وضاحت بھی کر دی ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ کتاب کے فارسی متن میں جہاں بھی کسی بادشاہ یا جغرافیائی حدود یا اس زمانے میں رائج پیمایش، رقبہ، وزن سے متعلق جو اصطلاحات رائج تھیں ان کو حاشیہ میں آج کی عام فہم فارسی زبان میں توضیح وتشریح بھی کی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ کام صرف متن کی تصحیح اور تجدید اشاعت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ انھوں نے حاشیہ کی صورت میں تحقیق سے بھی کام لیا ہے اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور معیاری بنانے کے لیے باقاعدہ طور پر گورکھپور کا سفر بھی کیا اور بہ نفس نفیس وہاں جا کر مشہور تاریخی عمارتوں کا خود مشاہدہ کیا۔ ساتھ ہی ان تمام عمارتوں اور آثار قدیمہ کی تصویریں بھی کتاب میں ضمائم کے طور پر شامل کر دی ہیں۔

یہ کتاب ۹۶ رصفحات پر مشتمل ہے جس میں سب سے پہلے مصحح یعنی فیضان حیدر نے ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا ہے اور اس میں گورکھپور کی تاریخ اور کتاب کے مولف اور کتاب کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب کے متن کا آغاز ہوا ہے جس میں مولف نے سب سے پہلے گورکھپور کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے وہاں کی آب و ہوا اور جغرافیا کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اسلام اور مسلمانوں اور وہاں کے حاکموں کے مختصر احوال بیان کیے ہیں۔ اسی طرح یہاں کی زراعت اور سرکاری عملداری کے متعلق بھی مفید گفتگو کی ہے۔ کتاب کے اصل متن کے اختتام کے بعد مصحح (فیضان حیدر) نے فہرست اعلام کے ذیل میں اشخاص واماکن ومصطلحات کو صفحات کے ساتھ ذکر کیا ہے تاکہ متن میں شامل قارئین کسی بھی لفظ کو بآسانی تلاش کر سکیں۔

یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید ہے لیکن مطالعے کے وقت اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اگر مصحح نے فارسی متن کے ساتھ اس کا اردو میں ترجمہ بھی کر دیا ہوتا تو اردو داں طبقہ بھی اس سے بہرہ مند ہوتا اور اس سے استفادے کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا۔

☆☆☆